

سَمَادَتِ حَسَنُ مَنُشُو



گنجِ فرشتے

# گنجِ فرست

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعرو ادب لاہور

۷۔ ڈی بلاک سی۔ سن آباد

جلا خرق بن سید شو مشورہ

ناشر ————— محمد نواز

اہتمام ————— سر قزاق احمد

مطبع ————— انستورڈی وینکٹر پریس

قیمت ————— ۱۸ روپے

گنجِ معانی حضرتِ غالب

کے نام

ہوس گلُ کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا  
عجب آرام دیا بے پرواہی نے مجھے

# ترتیب

۹	میرا صاحب
۳۷	آغا شہرے دو ملاقاتیں
۵۹	آغا شیرانی سے چند ملاقاتیں
۷۹	تین گر لے
۱۰۱	باری صاحب
۱۴۴	صحت چٹائی
۱۷۵	مرلی کی دھن
۲۱۱	پری چہرہ نسیم بانو
۲۳۷	اشوک کمار
۲۶۷	نرگس
۲۹۷	کشتہ زعفران
۳۱۵	باوراء پائیل
۳۳۷	گبنے فرشتے

## میرا صاحب

یہ سی سینٹس کا ذکر ہے۔ مسلم لیگ روہڑہ شاہب تھی۔ میں خود شاہب کی ابتدائی منزلوں میں تھا جب خواہ مخواہ کچھ کرنے کمری چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ صحت مند تھا، طاقت ور تھا اور جی میں ہر وقت یہی خواہش تڑپتی تھی کہ سامنے جو قوت آئے تو اُس سے بڑھ جاؤں اگر کوئی قوت سامنے نہ آئے تو اُسے خود پیدا کروں۔ اور یہ مقابل بنا کر اس سے گتہ جاؤں یہ وہ وقت ہوتا ہے جب آدمی ہر وقت کچھ کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے کچھ کرنے سے میرا مطلب ہے کوئی بڑا کام کوئی بہت بڑا کام نہ سرفہام نہ ہوا تو سرزد ہی ہو جائے۔ مگر کچھ ہو ضرور۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں پیرائے زمانے کی طرف لوٹتا ہوں جب غلبہ جوان تھا، مظلوم نہیں اُس نے اپنی جوانی کے دنوں میں کسی سیاسی تحریک میں حصہ

گئے فرشتے

یہ تھا یہ نہیں مگر خاکسار مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ غازی آباد کو مجھ ایسے کسی جوانوں کی ایک جماعت تھی جس کا میں ایک شخص ممبر تھا۔ اپنے اخلاص کا ذکر میں نے اس لیے بڑے وثوق سے کیا ہے — کہ اُن دنوں میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔

یہ اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ محمد علی جناح دہلی تشریف لائے اور مسلمانوں نے اُن کا شاندار جلوس نکالا جیسا کہ ظاہر ہے غازی آباد کو نے اس جلوس کو پُر رونق اور پُر جوش بنانے میں پورا حصہ لیا۔ ہماری جماعت کے سالارانہ قریشی صاحب تھے بڑے ترمذی جوان جو اب شاہرہ پاکستان کے لقب سے مشہور ہیں۔ ہماری کور کے جوانوں کے ہونٹوں پر انہی کا تصنیف کردہ قومی ترانہ تھا۔ معلوم نہیں ہم سڑکوں پر تھے یا نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ جو کچھ بھی ہمارے حلقے سے باہر نکلتا اُس کو سڑکوں کی پابندیوں میں جکڑنے کا ہوش کسی کو بھی نہیں تھا۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

نارہ پابند بننے نہیں ہے

یہ تاریخی جلوس تاریخی شہر دہلی کی تاریخی جامع مسجد سے شروع ہوا اور پُر جوش نعرے بکیرے تاجپاندنی چوک، لال کنواں، حوض قاضی اور چاؤڈی بازار سے ہوتا ہوا اپنی منزل یعنی مسلم لیگ کے آفس پہنچ کر ختم ہو گیا۔

اجتماعی طور پر اس تاریخی جلوس میں محمد علی جناح صاحب کوفتہ العظم کے

غیر فانی خطاب سے نعروں کی کیا گیا۔ ان کی سراسی کے لئے چھ گھنٹوں کی فٹن کا انتظام تھا۔ جلوس میں مسلم لیگ کے تمام سرکردہ اراکین تھے۔ موٹروں، موٹر سائیکلوں، بائیسکلوں اور اونٹوں کا ایک جرم تھا۔ مگر بہت ہی منظم۔ اس نظم کو دیکھ کر دیکھ کر قائمہ اعظم جو طبعاً بہت ہی نظم پسند تھے بہت مسرور نظر آتے تھے۔

میں نے اس جلوس میں ان کی کئی جھکیاں دیکھیں۔ ان کی پہلی جھک دیکھ کر میرا ردِ عمل سلوم نہیں کیا تھا۔ اب سوچتا ہوں اور تجزیہ کرتا ہوں تو صرف اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ خلوص چمکے بے رنگ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ردِ عمل بھی یقیناً بے رنگ تھا۔ . . . . . اس وقت اگر کسی بھی آدمی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا جاتا کہ وہ دیکھو تبارا قائمہ اعظم ہے تو میری عقیدت اُسے قبول کر لیتی اور اپنے سرسڑکوں پر جگہ دیتی۔ — لیکن جب میں نے جلوس کے مختلف موڑوں اور پھولوں میں ان کو کئی مرتبہ دیکھا۔ تو میری خون مندی کو دھکا سا لگا دیا۔ قائمہ اور اس قدر ڈرنا — اس قدر خیف !

خائب نے کہا تھا :

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

وہ ہمارے گھر آئے تھے۔ یہ ان کی مہربانی اور خدا کی قدرت تھی۔ خدا کی

قسم میں کبھی ان کو دیکھتا تھا۔ ان کے خیف و زلزلہ جسم کو۔ اُس مُشتِ



اور کبھی اپنے ہتے کٹے ڈیل ڈول کو جی میں آنا کر یا تر میں سکر جاؤں یا وہ پھل  
جائیں لیکن میں نے دل ہی دل میں اُن کے انہی ناتواں دست و بازو کو نظر بد سے  
منظر رکھنے کے لئے دعائیں بھی مانگیں۔ دشمنوں پر ان کے لگائے ہوئے زخموں  
کا چرچا عام تھا۔

حالات چٹا کھاتے ہی بہتے ہیں۔ معلوم نہیں پٹوں کا نام حالات ہے یا  
حالات کا نام پٹے۔ بہر حال کچھ ایسی صورت ہوئی کہ دماغ میں آرٹ کا کیڑا جو کچھ  
دیر سے سو رہا تھا۔ جاگا اور آہستہ آہستہ ریگنے لگا۔ طبیعت میں یہ اکسا بہت  
پیدا ہوئی کہ بچے چل کر اس میدان میں قسمت آزمائی کی جائے۔ ہمارے کی طرف  
بچپن کی مائل تہا۔ سوچا کہ شاید وہاں چل کر اپنے جو ہر دکھانے کا مرقع مل جائے  
— کہاں خدمتِ قوم و ملت کا جذبہ، اور کہاں ادالہ دہی کا ضبط۔ انسان میں  
جب مجرور اضمداد ہے۔

بچے پہنچا۔ ان دنوں امپیریل فلم کمپنی اپنے جوبن بدستھی۔ یہاں رسائی گز بہت  
ہی مشکل تھی۔ مگر کسی ذمہ دار کے ذریعے داخل ہو ہی گیا۔ آٹھ گھنٹے روز پراکھٹر کے طور  
پر کام کرتا تھا اور یہ خوب دیکھتا تھا کہ ایک روز آسمان فلم کا درخشندہ ستارہ  
بن جائے گا۔

اللہ کے فضل سے باتونی بہت ہوں۔ غرض گفتار نہ سہی تو کچھ ایسا بگستاخ  
بھی نہیں۔ اردو مادری زبان ہے جس سے امپیریل فلم کمپنی کے تمام ستارے

نا آشنا تھے۔ اس نے میری مدد دہلی کے بھانے بجے میں کی۔ وہ یوں کرواہاں کے قریب قریب تمام تاروں نے اپنی گردنوں کا حال مجھ سے کھوایا۔ اور پڑھوایا کرتے تھے۔ اردو میں کوئی خط آتا تو میں انہیں پڑھ کے سنانا۔ اس کا مطلب بتانا اس کا جواب لکھنا۔ مگر اس منشی گیری اور خطوط نویسی سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ اکثر اتنا اکثر اسی را۔

اس دوران میں امپیریل مسلم کمپنی کے مالک سیٹھ آرڈیشراپانی کے خلیفہ سونڈر ڈائیور بدھمن سے میری دوستی ہو گئی اور اس نے اس کا حق یوں ادا کیا کہ فرصت کے اوقات میں مجھے سونڈر چلانا سکھا دی مگر چونکہ یہ اوقات نہایت ہی مختصر ہوتے تھے اور بدھمن کو ہر وقت کسی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ سیٹھ کو اس کی چوری کا علم نہ ہو جائے۔ اس لئے میں اپنی تمام ذہانت کے باوصف سونڈر چلانے کے فن پر پوری طرح مادی نہ ہو سکا۔ مادی ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔ بہس یوں سمجھیے کہ مجھے بدھمن کی مدد کے بغیر لاف جیسی میدھی شکرک پر سیٹھ آرڈیشراپانی کیوک چلانا آگئی تھی۔ اس کے کل پرنوں کے متعلق میرا علم صفر تھا۔

اندکاری کی دھن سر پر بہت بُری طرح سوار تھی۔ مگر یہ سر کا معاملہ تھا۔ دل میں مسلم لیگ اور اُس کے روح درواں قائد اعظم محمد علی جناح پرستور رہے ہوئے تھے امپیریل فلم کمپنی میں، کینیڈی، برج پر، جھنڈی بازار اور محمد علی روڈ میں اور پلے آؤٹ پر اکثر مسلمانوں کی اقلیت کے ساتھ کانگرس کے سلوک کا تذکرہ ہوتا تھا۔

اپسڑی میں سب جانتے تھے کہ میں مسلم لیگی ہوں۔ اور قائمہ اعظم محمد علی جناح کا نام  
 بیوا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو کسی کے منہ سے قائمہ اعظم کا نام سن کر اس کے  
 جان بیز نہیں ہرجاتے تھے قیام پاکستان کا مطالبہ ابھی منظر عام پر نہیں آ رہا تھا۔ میرا خیال  
 ہے اپسڑی غم کینی کے لوگ جب مجھ سے قائمہ اعظم کا تعریفی ذکر سنتے تو یہ سمجھتے  
 تھے کہ وہ بھی کوئی ہیرو ہے جس کا میں پرستار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن اُس  
 زمانے کے سب سے بڑے نفی، سیرو ڈی بیوریانے ٹائمز آف انڈیا کا پرچہ میری  
 طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”لو جینی یہ تمہارے جناح صاحب ہیں!“

میں سمجھا ان کی کوئی تصویر بھی ہے۔ پرچہ ملی مریا کے دفتر سے لے آیا اٹ  
 پاٹ کے دیکھا۔ حیران کی شبہیہ نظر نہ آئی، میں نے اس سے پرچہ یا ٹیکوں جیتا  
 کہاں ہے ان کا فرور؟

بی مریا کی جرن گبرٹ اشائی کی باریک باریک مرتبچیں مسکرا ہٹ کے بوٹ  
 اُس کے ہنسنہ پر کچھ میل سی گئیں۔ ”چوٹو دوٹو نہیں ہے۔ ان کا اشتہار چیلنے  
 میں نے پرچہ؟ اشتہار؟ کیسا — اشتہار؟“

بی مریا نے پرچہ یا اور ایک بابا کا لم دکھا کر کہا: ”سٹر جناح کو ایک  
 موٹر کینک کی ضرورت ہے۔ حیران کے گرج کا سارا کام سنہال سکے۔“

میں نے اخبار میں وہ مجر دیکھی۔ جہاں بی مریا نے اعلیٰ دہی جوئی تھی، اور  
 ہیں ”ارہ“ کیا جیسے میں نے ایک ہی نظر میں اس اشتہار کا سارا مضمون پڑھ لیا ہے

حالا کہ واقعہ یہ ہے کہ ٹاکسار کو انگریزی اتنی ہی آتی تھی جتنی ڈی بی سہیا کو اردو۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میری موٹر ڈرائیور سی صرف الف ایسی سیدھی سڑک تک محدود تھی۔ موٹر کی میکنزم کیا ہوتی ہے اس کے متعلق حلام ہے جو مجھے کچھ علم ہو سلیف دبانے پر انجن کیوں اشارٹ ہوتا ہے۔ اس وقت اگر مجھ سے کوئی یہ سوال کرتا تو میں یقیناً یہ جواب دیتا کہ یہ قانون موٹر ہے سلیف دبانے پر یعنی اوقات انجن کیوں اشارٹ نہیں ہوتا — اس سوال کا بھی جواب یہ ہونا کہ یہ بھی قانون موٹر ہے جس میں انسانی فضل کو کوئی دخل نہیں۔

آپ کو حیرت ہو گی کہ میں نے بی سہیا سے جناح صاحب کے جنگلے کا پتا وغیرہ نوٹ کر لیا اور دوسرے روز صبح ان کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اصل میں مجھے ملازمت حاصل کرنے کا خیال تھا۔ اس کی توقع تھی۔ بس یونہی ان کو ان کی رہائش گاہ میں قریب سے دیکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ اپنے خلوص کو ڈپوسٹ کے طور پر ساتھ لیٹے میں موٹ پلینزٹ روڈ واقع بالا بارہل پر ان کی خوش نما کوٹھی پر پہنچ گیا۔ باہر پتھان پہرہ دار تھا۔ کئی قانون کی سفید شلوار، سروریشی لنگ بہت ہی صاف ستھرا اور باریب، گرائڈیل اور طاقتور، اس کو دیکھ کر میری طبیعت خوش ہو گئی۔ دل ہی دل میں کئی مرتبہ میں نے اس کے اور اپنے فزک کی پیمائش کی اور یہ محسوس کر کے مجھے بڑی عجیب سی تسکین ہوئی کہ فرق بہت معمولی ہے یہی کوئی ایک آدھ انچ کا۔

مجھ سے پہلے اور کئی امیدوار جمع تھے۔ سب کے سب اپنی اسناد کے ہندے  
 بفل میں دبائے کھڑے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ بڑے غرے کی بات  
 یہ ہے کہ اسناد تو ایک طرف رہیں۔ میرے پاس ڈسٹریکٹ کالکٹریٹ کا سرٹیفکیٹ  
 تک نہیں تھا۔ اُس وقت دل صرف اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ بس اب  
 چند محفل میں قائد اعظم کا دیدار ہونے والا ہے۔

میں ابھی اپنے دل کی دھڑکن کے متعلق صحیح ہی رہا تھا کہ قائد اعظم  
 پورچ میں نمودار ہوئے سب اٹھ کھڑے ہو گئے۔ میں ایک طرف سمٹ گیا۔ اُن کے ساتھ  
 اُن کی دراز اور کئی چلی بٹیر تھیں جن کی متعدد تصاویر میں اخباروں اور رسالوں میں  
 دیکھ چکا تھا۔ ایک طرف ہٹ کر اُن کے باادب مکتبہ مطلوب صاحب تھے۔  
 جناح صاحب نے اپنی یکم چشمی بینک آنکھ پر جمائی اور تمام امیدواروں کو  
 بڑے غرے سے دیکھا۔ جب اُن کی سیل آنکھ کا رخ میری طرف ہوا۔ تو میں اور  
 زیادہ سمٹ گیا۔ فوراً اُن کی کھب جانے والی آواز بلند ہوئی مجھے صرف اتنا  
 سنائی دیا: یو۔۔۔؟

آئی انگریزی میں جانتا تھا۔ اُن کا مطلب تھا: تم۔ مگر وہ تم کہن تھا۔  
 جس سے وہ مخاطب ہوئے تھے! میں سمجھا کہ میرے ساتھ والا ہے چنانچہ میں  
 نے اُسے کہنی سے ٹھوکا دیا اور کہا: ”یو۔۔۔ تمہیں پتا ہے میں؟“  
 میرے سامنے نے گفت بھرے بھر میں پوچھا: ”صاحب میں؟“

فائدہ اعظم کی آواز پھر بلند ہوئی۔ "نو — تم —"

اُن کی باریک مگر لڑ ہے جیسی سخت انگلی میری طرف تھی۔ میرا تن بدن کانپ اٹھا جی جی — میں ؟

"میں ؟ یہ تیری ہنٹ تھری کی گولی تو میرے دل و دماغ کے پار ہو گئی میرا صلیق — فائدہ اعظم کے تھری بند کرنے والا صلیق بالکل ٹوکھ گیا۔ میں کچھ نہ کہہ سکا — مگر جب انہوں نے اپنا منہ کل آگے سے اتار کر آل رائٹ کہا تو میں نے عروس کیا کہ شاید میں نے کچھ کہا تھا جو انہوں نے سن لیا تھا یا وہ میری کیفیت بجا پ گئے تھے اور میرے نطق کو مزید اذیت سے پہلے کے لئے انہوں نے آل رائٹ کہہ دیا تھا۔

پٹ کہ انہوں نے اپنے حسین و جمیل اور صحت مند سیکرٹری کی طرف دیکھا اور اُس سے کچھ کہا۔ اس کے بعد وہ اپنی ہمشیرہ کے ساتھ اندر تشریف لے گئے میں اپنے دل و دماغ کی گڑ بڑ جلدی جلدی سمیٹ کر وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ مطلوب صاحب نے مجھے پکارا۔ اور کہا کہ صاحب نے تمہیں کل دس بجے یہاں حاضر ہونے کے لئے کہا ہے۔

میں مطلوب صاحب سے یہ سوال نہ کہہ سکا کہ صاحب نے مجھے کیوں بلایا ہے اُن کی کچھ بھی نہ بتا سکا کہ میں بلائے جانے کے ہرگز ہرگز قابل نہیں ہوں۔ اس لئے کہ میں اس ملازمت کا بالکل اہل نہیں۔ جس کے لئے فائدہ اعظم نے اشتہار دیا ہے

وہ بھی اندر چلے گئے اور میں گھر لوٹ آیا ۔

دوسرے دن صبح دس بجے پھر در دولت پر حاضر ہوا۔ جب اطلاع کرائی تو ان کے خوش پوش حسین و جمیل اور صحت مند سیکرٹری تشریف لائے اور مجھے یہ حیرت انگیز مشورہ سنایا کہ صاحب نے مجھے پسند کیا ہے ۔ اس لئے میں فوراً گراج کا چارج لے لوں ۔

یہ سن کر جی میں آئی کہ ان پر بلا ہتی قابلیت کا سارا پرل کھول دوں اور صاف صاف کہہ دوں کہ حضرت قائد اعظم کو اس خاکسار کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے میں تو محض تفریحاً یہاں چلا آیا تھا۔ یہ آپ گراج کا بوجھ اس نا اہل کے کندھوں پر کیوں دھر رہے ہیں مگر جانے کیوں میں کچھ نہ بولا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹا خانا گراج کا پردہ خان بنا دیا گیا۔ چابیاں میرے حوالے کر دی گئیں۔ چار کاریں تھیں مختلف میک کی اور مجھے صرف سیٹھ آرڈیشیر ایرانی کی بیوک چلانا آتی تھی۔ اور وہ بھی الٹ جیسی سیدھی سڑک پر۔ والا بارہل تک پہنچنے میں کئی سوڑتھے۔ کئی ٹھم اور موٹر میں آزاد کو صرف اپنی اکیلی جان نہیں لے جاتا تھی۔ اسے خدا معلوم کن کن اہم کاموں پر اس رہنما کو بیٹھے بیٹھے پھرنانا تھا۔ جس کی زندگی کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کی جان وابستہ تھی ۔

میں نے سوچا چابیاں وغیرہ سب چھوڑ چھوڑ کے جھاگ جاؤں بھاگ کے سیدھا گھر پہنچوں۔ وہاں سے اپنا اسباب اٹھاؤں اور کٹ کٹا کے دہلی کا

رُخ کروں۔ مگر پھر سوچنا یہ درست نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ بلا کم و کاست جناب صاحب کو سارے حقائق سے باخبر کر دوں اور معافی مانگ کر انسانوں کی طرح واپس اس جگہ چلا جاؤں جو کہ میرا اصل مقام ہے مگر آپ یقین مانے کہ مجھے پورے چھ بجے تک اس کا موقع نہ ملا۔

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

محمد حنیف آزاد نے جواب دیا۔ ”آپ سن لیجئے۔ دوسرے روز حکم ہوا کہ آزاد موٹر لائے۔ وہ جو ایسے سوتھوں پر خطا ہوا کرتا ہے، خطا ہوتے ہوتے رو گیا میں نے ارادہ کر لیا کہ جو بہنی صاحب سامنے آئیں گے سلام کر کے گراچ کی چابیاں ان کے حوالے کر دوں گا اور ان کے قدموں میں گر پڑوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ پورچ میں تشریف لائے تو اس بندہ نابکار کے منہ سے رعب کے ایسے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ فاطمہ صاحبہ تھیں، عورت خمر تلنے کسی کے قدموں میں گرنا، منو صاحب، کچھ بہت وہ تھا۔“

میں نے آزاد کی موٹی موٹی آنکھوں میں شرم کے لال لال ڈورے دیکھے اور مسکرا دیا: ”خیر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“

ہوا یہ منو صاحب کو خاکسار کو موٹر اشارٹ کرنی ہی پڑی۔ نئی پیکر ڈھٹی اللہ کا ہم لے کر اگلے پتھر اشارٹ تو کر دی۔ اور بڑی صفائی سے کوٹھی کے باہر بھی لے گیا، پر جب بالا بارہل سے نیچے اترنے وقت لال لال بٹی کے منہ کے پاس پہنچا



جانتے ہیں نہ لال جتی؟

میں نے اثبات میں سر ملایا: "ہاں ہاں!"

"بس صاحب، وہاں شکل پیدا ہو گئی۔ اشارہ من نے کہا تھا کہ بیک دبا کر  
سانڈ ٹیک کر لیا کرو۔ انرا تفری کے عالم میں کچھ ایسے انارڈی پن سے بیک بنائی کہ  
گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رکی۔ قائد اعظم کے ہاتھ سے اکی کا سگار گر پڑا۔  
فاطمہ جناح صاحبہ اچھل کر وہ بات آگے۔ لگیں بے گایاں دینے۔ کاؤ  
تو بھر نہیں میرے بدن میں ہاتھ کا پھنس گئے۔ دارغ پکڑانے لگا۔ قائد اعظم نے سگار  
اٹھایا اور انگریزی میں کچھ کہا۔ جس کا غالباً یہ مطلب تھا کہ واپس لے چلو۔ میں نے  
حکم کی تعمیل کی۔ تو انہوں نے نئی گاڑی اور تیار ڈرائیور طلب فرمایا اور چپاں جانا مت  
چلے گئے۔ اس واقعے کے بعد چھ مہینے تک مجھے ان کی خدمت کا موقع نہ ملا۔  
میں نے مسکرا کر پوچھا: ایسی ہی خدمت کا؟

آزاد بھی مسکرایا: "جی ہاں۔ بس میں سمجھے کہ صاحب نے مجھے اس کا موقع  
نہ دیا دوسرے ڈرائیور تھے۔ وہ ان کی وردی میں رہتے تھے مطلوب صاحب رات  
کو بتا دیتے تھے کہ کون ڈرائیور کب اور کس گاڑی کے لئے چاہیئے۔ میں اگر ان سے  
اپنے تعلق کچھ دریافت کرتا تو وہ کوئی فاطمہ خواہ جواب نہ دے سکتے۔ یہ مجھے بد  
میں معلوم ہوا۔ صاحب کے دل میں کیا ہے۔ اس کے تعلق کوئی بھی وثوق سے  
کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اور نہ ان سے کوئی کسی امر کے بارے میں استفسار ہی کر سکتا

تھادہ صرف مطلب کی بات کرتے تھے اور مطلب کی بات ہی سنتے تھے یہی وجہ ہے کہ میں اُن سے اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی یہ معلوم نہ کر سکا کہ اپنے گراں گاہ کو اتنا بنا کر ایک بے کار پرزے کی طرح انہوں نے مجھے کیوں ایک طرف پھینک رکھا ہے۔ میں نے آزاد سے کہا: ہر گز نہ ہے وہ تمہیں قطعاً سمجھوں ہی گئے ہوں۔

آزاد کے حلق سے وزنی قبیلہ بلند ہوا: "نہیں جناب نہیں۔" صاحب مجھے سے بھی کہیں نہیں جانتے تھے۔ اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آزاد چھ بیٹے سے گراں میں پڑا روٹیاں توڑ رہا ہے۔ اور مگر صاحب جب آزاد روٹیاں توڑے تو وہ مولیٰ روٹیاں نہیں ہوتیں۔ یہ تو قورق ملاحظہ فرمائیے۔"

میں نے آزاد کی طرف دیکھا۔ سن سینٹس، انریس میں جانے اس کا کیا حق تھوڑا تھا۔ مگر میرے سامنے ایک کان منبوط اور ترمند آدمی بیٹھا تھا۔ جس کو آپ ایگزٹ کی حیثیت میں یقیناً جانتے ہوں گے۔ تقسیم سے پہلے وہ بیٹی کی مجلسوں میں کام کرتا تھا۔ اور کچھ کل یہاں لاہور میں اپنے دوسرے ایگزٹ جانیوں کے ساتھ فلمی صنعت کی زبوں حالی کا شکار کسی نہ کسی چلے گذراوقات کر رہا ہے۔

مجھے پچھلے برس ایک دوست سے معلوم ہوا تھا کہ یہ مولیٰ مولیٰ آنکھوں سیاہ رنگ اور کسرتی بن والا ایگزٹ ایک مدت تک قائد اعظم محمد علی جناح کا ممبر ڈائریٹر رہ چکا ہے۔ چنانچہ اُس وقت سے میری نگاہ اس پر تھی، جب کہیں اس سے ملاقات ہوتی ہی اُس کے آٹا کا ڈرکھڑپتا اور اس سے باتیں سن سن کر اپنے حافطے میں جمع کرتا رہتا۔

کل جیب میں نے یہ معنوں کھٹنے کے لئے اس سے کہی باتیں دوبارہ سنیں تو مجھے  
 قائد اعظم کی زندگی کے ایک بہت ہی دلچسپ پہلو کی جھلک نظر آئی۔ محمد حنیف آزاد  
 کے ذہن پر اس بات نے خاص طور پر اثر کیا تھا کہ اس کا آقا طاقت پسند تھا جس  
 طرح علامہ اقبال کو بلند قیامت چیزیں پسند تھیں۔ اسی طرح قائد اعظم کو غرور مند  
 چیزیں مرغوب تھیں، یہی وجہ ہے کہ اپنے لئے ملازموں کا انتخاب کرتے وقت وہ  
 جسمانی صحت اور طاقت سب سے پہلے دیکھتے تھے۔

اُس زمانے میں جس کا ذکر محمد حنیف آزاد کرتا ہے قائد اعظم کا سیکرٹری ملوث  
 بڑا وسیع آدمی تھا جتنے ڈراما یڈ تھے، سب کے سب جسمانی صحت کا بہترین نمونہ تھے  
 کوٹلی کے پاسیوں بھی اسی نقطہ نظر سے چنے جاتے تھے۔ اس کا نفاذاتی پس منظر  
 اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جناب مرحوم خود بہت ہی لاغر اور نحیف تھے مگر  
 طبیعت چوکم بے حد مضبوط اور کسرتی تھی اس لئے کسی ضعیف اور نحیف شخص کو خود  
 سے مغرب ہوتا پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ چیز جو انسان کو مرغوب اور پیاری ہو، اس کے بناؤ سنگار کا وہ خاص  
 اہتمام کرتا ہے چنانچہ قائد اعظم کو اپنے صحت مند اور طاقتور ملازموں کی پرورش کا بہت  
 خیال رہتا تھا۔ پٹھان چوکیدار کو حکم تھا کہ وہ ہمیشہ اپنا قومی لباس پہنا کر سے آزاد چٹائی  
 نہیں تھا۔ لیکن کبھی کبھی ارشاد ہوتا تھا کہ گڑھی پہنے، سر کا یہ لباس بڑا طر حد در  
 ہے چونکہ اس سے قد و قامت میں عموماً گوارا اضافہ ہوتا ہے اس لئے

وہ اس کے سر پر گھڑی بندھا کر بہت خوش ہوتے تھے، اور اس خوشی میں اس کو انعام دیا کرتے تھے۔

اگر غور کیا جائے تو جسم کی ماضی کا یہ احساس ہی ان کی مضبوط اور پُر وجاہت زندگی کی سب سے بڑی قوت تھی۔ ان کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، اور بولنے سوچنے میں یہ قوت ہر وقت کار فرما رہتی۔

محمد حنیف آزاد نے مجھے بتایا کہ قائد اعظم کی عرواک بہت ہی قلیل تھی: وہ اتنا کم کھاتے تھے کہ مجھے بعض اوقات تعجب ہوتا تھا کہ وہ جیسے کس طرح ہیں۔ اگر مجھے اُس عرواک پر دکھایا جاتا تو یقیناً دوسرے ہی روز میری چربی گھسنے لگتی۔ ایسی کسی اس کے برعکس ہر روز چار پانچ مرغیاں، باورچی خانہ میں ذبح ہوتی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک چوزے کی کھنٹی اور وہ بھی بشکل ایک چھوٹی پیالی ان کی عرواک کا جزو تھی۔ قریب ہر روز آتا تھا۔ اور کافی وقت داریں آتا مگر یہ سب ملازموں کے پیٹ میں جاتا تھا۔

”ہر روز رات کے کھانے کے بعد صاحب کا فائدہ اشتیاء خود دینی کی فہرت پریشان لگا دیتے تھے اور ایک سو کا نوٹ میرے حوالے کر دیتے تھے۔ یہ دوسرا روز کے طعام کے اخراجات کے لئے ہوتا تھا۔“

میں نے آزاد سے پوچھا۔ ”ہر روز سو روپے؟“

”جی ہاں! پندرہ سو روپے۔ اور قائد اعظم کسی حساب طلب نہیں فرماتے

تھے جو باقی بچتا وہ سب ملازموں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ کبھی تیس سوچ جاتے تھے۔ کبھی چالیس اور کبھی کبھی ساٹھ ستر اُن کو فیضاً اس بات کا علم تھا کہ ہم ہر روز بیت سے روپے گول کرتے ہیں۔ مگر اس کا ذکر انہوں نے کبھی نہ کیا۔ البتہ مس جناح بہت تیز تھیں۔ اکثر گڑ جاتی تھیں کہ ہم سب چور ہیں۔ ایک آنے کی خیر کا ایک ٹریچ لگاتے ہیں۔ مگر صاحب کا سوک کچھ ایسا تھا کہ ہم سب اُن کے مال کو اپنا مال سمجھنے لگے تھے چنانچہ ان کی جھڑکیاں اور گھرکیاں سُن کر اپنے کان سمیٹ بیٹھتے تھے۔ صاحب ایسے برصغور پر اپنی ہمیشہ سے "اٹ از آل رائٹ۔ اٹ از آل رائٹ" کہتے اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

مگر ایک دفعہ "اٹ از آل رائٹ" کہنے سے معاملہ رفع نہ ہوا۔ اور محنت نہ مس جناح نے باورچی کو نکال دیا۔ ایک باورچی کو نہیں دونوں باورچیوں کو کیونکہ قائد اعظم بیک وقت باورچی خانے کے لئے دو ملازم رکھتے تھے۔ ایک وہ جو ہندوستانی کھانے پکانا جانتا ہو۔ دوسرا وہ جو انگریزی طرز کے کھانے پکانے کی مہارت رکھتا ہو۔ عام طور پر ہندوستانی باورچی بیکار چڑا رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی بعض اوقات جنہیں کے بعد اس کی بادی آتی تھی۔ اور اس کو حکم ملتا تھا کہ وہ ہندوستانی کھانے تیار کرے۔ مگر قائد اعظم کو اس سے دلی رغبت نہیں تھی۔

آزاد نے بتایا: "جب دونوں باورچی نکال باہر کئے گئے تو صاحب نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی ہمیشہ کے معاملوں میں دخل نہیں دیا کرتے تھے چنانچہ کئی دن

دونوں وقت کا کھانا آج ہوٹل میں تناول فرماتے رہے اس دوران میں ہم لوگوں نے  
 خوب میٹھ کینے مگر سے موڑے کر کے باورچیوں کی تلاش میں نکل جاتے اور ٹھنڈی  
 ادھر اُدھر گھوم گھام کو واپس آجاتے تھے کہ کام کا کوئی آدمی نہیں ملا آخر میں بس  
 جناح کے کہنے پر پانے باورچی واپس بلائے گئے۔

جو شخص بہت کم خور ہو وہ دوسروں کو بہت کھاتے دیکھ کر یا تو جلتا جھٹکتا ہے  
 یا بہت خوش ہوتا ہے قائد اعظم دوسری قیل کے کم خوروں میں تھے وہ دوسروں کو  
 کھانا کو دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر روز سو روپے دے کر وہ  
 حساب کتاب سے بالکل غافل ہو جاتے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسراف پسند  
 تھے۔ محمد حنیف آزاد ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے۔

”یہ سن اتالیق کا ذکر ہے شام کے وقت دہلی کی میر ہو نہی صحت میں ان  
 کی سفید پیکار ڈاؤن آئے آہستہ چلا رہا تھا۔ سمندر کی موجیں ہوسے ہوسے ساحل سے  
 ٹکراتی تھیں۔ موسم میں گلابی خوشگنتی۔ صاحب کا موٹو بہت اچھا تھا میں نے جتنے  
 پاکر حید کا ذکر چھڑا اس سے جو میر اسطوب تھا وہ ظاہر ہے صاحب فوراً تار گئے  
 میں نے بیک دیر میں دیکھا ان کے چہرے ہونٹ مکرانے ذرا ہونے والا  
 سگرمز سے نکال کر انہوں نے کہا ”اوہ... دل... دل... ابھی تم ایک  
 دم مسلمان ہو گیا ہے۔“ مقتدر اہندو بنو۔

اس سے چار روز پہلے قائد اعظم آزاد کو مسلمان بنا چکے تھے یعنی انعام کے

طور پر اسے دوسو روپے دے چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کو خنڈوا سا ہندو بننے کی تلقین کی۔ مگر آزاد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس عید پر وہ سید مرتضیٰ جیلانی فلم پروڈیوسر کے پاس اپنی مسلمانی مستحکم کرنے کی غرض سے آیا تاکہ اس سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے یہ مضمون تیار کرنے کے لئے اس سے مزید معلومات حاصل کیں۔

قائد اعظم کی گھریلو زندگی کا نقشہ مستور ہے اور ہمیشہ مستور رہے گا۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کی گھریلو زندگی، ان کی سیاسی زندگی میں کچھ اس طرح منظم ہو گئی تھی کہ اس کا وجود ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ بیوی تھی، وہ مدت ہوئی ان سے جدا ہو چکی تھی۔ لڑکی تھی اس نے ان کی مرضی کے خلاف ایک پارسی لڑکے سے شادی کر لی تھی۔

محمد حنیف آزاد نے مجھے بتایا: "صاحب کو اس کا سخت صدمہ پہنچا تھا ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرے تو وہ کسی بھی رنگ و نسل کا ہو۔ لیکن ان کی لڑکی جواز پیش کرتی تھی کہ جب صاحب کو اپنی شریک زندگی منتخب کرنے میں آزادی حاصل تھی تو وہ یہ آزادی اسے کیوں نہیں بخشے؟"

قائد اعظم نے بچنے کے ایک بہت بڑے پارسی کی لڑکی سے شادی کی تھی یہ تو سب کو معلوم ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم آدمیوں کو معلوم ہے کہ پارسی اس رشتے سے بہت ناخوش تھے، ان کی یہ گزشتہ اور خواہش تھی کہ جناح صاحب سے بد لیں۔

چنانچہ بعض دقیقہ رس اصحاب کا یہ کہنا ہے کہ قائما غلم کی لڑکی کا پارسی لڑکے سے شادی کرنا ایک منظم سازش کا نتیجہ ہے، میں نے جب اس کا ذکر کذاب سے کیا تو اس نے کہا: اللہ بہتر جانتا ہے لیکن مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ صاحب کی زندگی میں اپنی بیوی کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا، جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کی صاحبزادی نے ایک پارسی سے شادی کر لی ہے تو وہ بے حد متاثر ہوئے، ان کا چہرہ اس قدر لطیف تھا کہ معمول سے معمول بھی اس پر آثار چڑھاؤ پیدا کر دیتا تھا جو دوستوں کو فوراً نظر آ جاتا تھا۔ اتنے پر ہلکی سی شکن ایک خرقہ کی خط کی صورت اختیار کر جاتی تھی — ان کے دل و دماغ پر اس حادثے سے کیا گزری، اس کے متعلق مرحوم ہی کہہ سکتے تھے ہمیں صرف خارجی ذریعوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت مضطرب رہے، چند روز تک وہ کسی سے نہ ملے اس دوران میں انہوں نے سینکڑوں سگار پھونک ڈالے ہوں گے۔ اور سینکڑوں میل ہی اپنے گھر سے۔ میں ادھر ادھر جکر لگا کر طے کئے ہوں گے۔

”سچ بچار کے عالم میں ان کو ادھر ادھر ٹھینے کی عادت تھی۔ رات کے سنڈے میں وہ اکثر پختہ اور بے داغ فرش پر ایک حصے تک بٹھتے رہتے تھے پتے قدم ادھر سے ادھر ایک فاصلہ، خاموش فضا، جب وہ چلتے تو ان کے سفید اور کالے یا سفید اور براؤن شوز ایک عجیب قسم کی ایک آہنگ تک تک پیدا کرتے جیسے کلاک معین و تھنوں کے بعد اپنی زندگی کی خبر دے رہا ہے۔ قائما غلم کو اپنے جوتوں سے



پیار تھا۔ اس لئے کہ وہ ان کے قدموں میں ہوتے تھے اور ہر وقت ان کے اشاروں پر چلتے تھے ۲

”پندرہ دن مسلسل ذہنی اور روحانی طور پر مضطرب رہنے کے بعد ایک روز ایک ایسی ٹھنڈی ہوا چھوٹے، ان کے چہرے پر اب اس حد سے کافی اثراتی نہیں تھا۔ ان کی گردن جس میں فروغ کے باعث خفیف سانم پیدا ہو گیا تھا، پھر کسی طرح سیدھی اور اگلی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس حد سے کہ باطل مہول گئے تھے؟ جب آزاد نے قائم اعظم کی زندگی کے اس حد سے کہ ذکر وہ بارہ چھیڑا تو میں نے اس سے پوچھا: وہ اس حد سے کہ نہیں بولے تھے۔ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

آزاد نے جواب دیا: ”غلاموں سے کیا بات چھیڑتی ہے۔ کبھی کبھی وہ صندوق کھولنے کا حکم دیتے تھے۔ جس کے اس جہازی صندوق میں بے شمار کپڑے تھے، ان کی مرحوم بیوی اور نازنا سردار لڑکی کے۔ جب وہ چوٹی سی پتی تھی بیگم کے باہر نکالے جاتے تو صاحب بڑی سنگین خاموشی سے ان کو دیکھتے رہتے۔ ایک دم ان کے ہنپے پتے اور شفات چہرے پر غم و اندوہ کی کیرول کا ایک جال سا بھر جاتا۔ اٹ اٹ اٹ اٹ۔ اٹ اٹ اٹ اٹ۔ کہہ کر وہ اپنی آنکھ سے مونہ کل آندرتے اور اُسے پر پختے ہوئے ایک طرف چل دیتے۔“

محمد حنیف آزاد کے بیان کے مطابق قائم اعظم کی تین بیویں: فاطمہ بنت رحمت خواجه، تیسری کا نام مجھے یاد نہیں، وہ ڈاگری میں رہتی تھیں۔ چوہائی کا درو

نزدجائی مولود کس پر رحمت جناح مقیم تھیں، ان کے شر ہر کہیں ملازم تھے، آمدن قلیل تھی، صاحب ہر پہننے والے ایک بند باندہ دیتے۔ جس میں کچھ کرنسی نوٹ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ایک پارسل سا بھی دیتے۔ جس میں قابا پکڑے وغیرہ ہوتے تھے۔ یہ چیزیں مجھے رحمت جناح کے ان پہناتا ہوتی تھیں۔ یہاں میں غافل خان اور خود صاحب بھی کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ وہ بہن جو ڈوگری میں رہتی تھیں، شادی شدہ تھیں، ان کے متعلق مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آسودہ حال تھیں، اور کسی امعاد کی محتاج نہیں تھیں۔ ایک بھائی تھا، اس کی مدد وہ باقاعدہ کرتے تھے مگر اس کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔

تائما اعظم کے اس بھائی کو میں نے بچے میں دیکھا ہے، میوٹائے بار میں ایک شلم کریں نے دیکھا کہ تائما اعظم کی شکل و صورت کا ایک آدمی آدھارم کا آرڈر دے رہا ہے۔ ویسا ہی ناک نقش، ویسے ہی اُلٹے کنگھی کئے ہوئے بال، قریب قریب ویسی ہی سفید لٹ۔ میں نے کسی سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مشر محمد علی جناح کا جانی احمد علی ہے۔ میں بہت دیر اس کو دیکھتا رہا، دم کا آدھارمیک اس نے بڑی شان سے آہستہ آہستہ لبوں کے ذریعے سے چس چس کر ختم کیا بل جو ایک روپے سے کم تھیں ادا کیا جیسے ایک بہت بڑی رقم ہے اور اس کی نشست سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بچے کی ایک گھٹیا بار کے بجائے تاج محل ہوٹل کے شراب خانے میں بیٹھا ہے۔

گاندھی جناح کی تاریخی ملاقات سے کچھ دیر پہلے بجے میں مسلمانوں کا ایک تاریخی اجتماع ہوا۔ میرے ایک دوست اس جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پیٹ فارم پر قائد اعظم اپنے مخصوص انداز میں تقریر کر رہے تھے اور بہت دُور ان کا بھائی احمد علی آنکھ پر سونوکل لگائے کچھ اس انداز سے کھڑا تھا۔ جیسے وہ اپنے بھائی کے الفاظ و باتوں تلے چبارا ہے۔

اندولن خانہ کھیلوں میں قائد اعظم کو صرف بیئرڈ سے دلچسپی تھی۔ یہ کہیں کہیں جب ان کو اس کھیل سے شغل فرمانے کی خواہش ہوتی تو وہ بیئرڈ روم کھلوانے کو حکم دیتے۔ صفائی وں تو ہر کمرے میں ہر روز ہوتی تھی، مگر جب وہ کسی خاص کمرے میں جانے کا ارادہ فرماتے تو ملازمین ان کے داخلے سے پہلے اپنا اچھی طرح اطمینان کر لیتے۔ کہ ہر چیز صاف ستھری اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ بیئرڈ روم میں مجھے جانے کی اجازت تھی۔ اس لئے کہ مجھے بھی اس کھیل سے تھوڑا بہت شغف ہے۔ بارہ گیندیں ان کی خدمت میں پیش کر دی جاتیں، ان میں سے وہ انتخاب کرتے اور کھیل شروع ہو جاتا۔ جمستہ فاطمہ جناح پاس ہوتیں، صاحب سگار سلگا کر ہونٹوں میں دبا لیتے۔ اور اس گیند کی پوزیشن کو اچھی طرح جانچتے جس کے ٹھوک لگانا ہوتا تھی، اس جانچ پر حال میں وہ کئی منٹ صرف کرتے، کبھی ایک زاویے سے دیکھتے کبھی دوسرے زاویے سے۔ حاضرین کیوں کہ قوت سے اپنی پتلی پتلی انگلیوں پر اسے سادگی کے گز کی طرح پھیرتے زیرِ لب کہہ کتے بہشت باندھتے، مگر کوئی دوسرا مناسب و موزوں زاویہ ان کے ذہن میں آتا اور

وہ اپنی ضرب دلاک بیٹے۔ ہر طرف سے اپنا پورا اطمینان کرنے پر جب کیو گیند کے ساتھ ٹکرائے اور نتیجہ ان کے حساب کے مطابق ٹیک نکلتا تو اپنی بہن کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرائے تھے۔

سیاست کے کھیل میں قائداً عظیم اسی طرح متناظر تھے۔ وہ ایک دم کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے، ہر سٹے کو وہ بیئرڈ کے میز پر پڑی ہوئی گیند کی طرح ہر زاویے سے بنورد دیکھتے تھے اور صرف اسی وقت اپنے کیو کو حرکت میں لا کر ضرب لگاتے تھے جب ان کو اس کے کارگر ہونے کا پورا وثوق ہوتا تھا۔ وار کرنے سے پہلے شکار کی اپنی لگا ہوں میں ابھی طرح تول لیتے تھے۔ اس کی نشست کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیتے تھے، پھر اس کی جہاست کے مطابق اختیار منتخب کرتے تھے، وہ ایسے شکاری نہیں تھے کہ بہت تول اٹھایا اور داغ دیا، اس یقین کے ساتھ کہ نشانہ خطا نہیں جائیگا شکاری کی ہر تلخ خطا شست باندھنے سے پہلے ان کے پیش نظر رہتی تھی۔

آزاد کے بیان کے مطابق قائداً عظیم عام ملاقاتیوں سے پرہیز کرتے تھے ھو دو روز کار باتوں سے انہیں سخت نفرت تھی، صرف مطلب کی بات اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ سُنے اور کرنے کی عادت تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے خاص کمرے میں جہاں بہت کم لاگوں کو داخلے کی اجازت تھی، صرف ایک صوفہ تھا اس صوفے کے ساتھ ایک چھوٹی سی تپائی تھی۔ اس میں صاحب اپنے سگار کی دلاک پھیلتے تھے۔ صوفے کے باقاعدہ دو شوکیں تھیں۔ ان میں وہ قرآن مجید رکھے رہتے تھے جو

ان کے عقیدت مندوں نے ان کو تحفے کے طور پر دیئے تھے اس کمرے میں ان کے ذاتی کاغذات بھی محفوظ تھے۔ عام طور پر وہ اپنا زیادہ وقت اسی کمرے میں گزارتے تھے اس میں کوئی میز نہیں تھا۔ مطلوب یا کوئی اور شخص جب بھی اس کمرے میں بلایا جاتا تو اسے دروازے میں کھڑا رہنا پڑتا۔ یہیں وہ صاحب کے احکام سنتا اور اُلٹے پاؤں چلا جاتا۔ صوفے کے خالی حصے پر ان کے زیر مطالعہ کاغذات بکھرے رہتے تھے۔ کوئی خط لکھوانا، ہوتا تو مطلوب کو یا اسٹینو کو بولواتے اور خط یا بیان کی عبارت بول دیتے۔ ان کے لہجے میں ایک قسم کی کرتلی تھی۔ میں انگریزی زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہوں لیکن جب وہ بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زور دے رہے ہیں۔

آزاد کے مختلف بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قائد اعظم کی جسمانی کمزوری کا غیر شعوری یا تحت الشعوری احساس ہی ان کی سخت مظاہر کا باعث تھا۔ ان کی زندگی حجاب برآب تھی، مگر وہ ایک بہت بڑا مجنوں ہی کے رہتے تھے، بعض اصحاب کا تو یہ کہنا ہے کہ وہ اتنے دن صرف اسی قوت کے بل پر جیئے — جسمانی کمزوری کے اس احساس کی قوت پر۔

محمد حنیف آزاد کے بیان کے مطابق بہادر یا رچنگ مرحوم قائد اعظم کے بہترین دوستوں میں سے تھے صرف انہی سے ان کے مراسم بہت بے تکلفانہ تھے وہ جب بھی ان کے یہاں قیام کرتے تو یہ دونوں شخصیتیں شفیق و ستائندہ انداز میں قومی اور

سیاسی مسائل پر غور کرتی تھیں۔ اس وقت قائد اعظم اپنی آسرتیت کچھ عرصے کے لئے اپنی شخصیت سے جدا کر دیتے۔ ان میں نے صرف یہی ایک شخص دیکھا جس سے طلب جموں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بچپن کے ساتھی ہیں جب آپس میں باتیں کرتے تو کوئی مرتبہ قید و بند سے آزاد قیدیوں کی آواز سنائی دیتی۔ بہادر یار جنگ کے علاوہ مسلم لیگ کے دوسرے سربراہان و رہنما ایسے مثال کے طور پر راجہ محمود آباد، آئی رائی چندریگر، مولانا زاہد حسین، نواب زادہ بیات علی خان، نواب اسماعیل اور علی امام صاحب اکثر تشریف لاتے تھے۔ لیکن صاحب ان سے باطل و فخری آمیز میں پیش آتے۔ وہ بے تکلفی کہاں جو بہادر یار جنگ کے لیے مخصوص تھی۔

میں نے آزاد سے پوچھا: "خان بیات علی خان ترا کثرتے ہوں گے؟" آزاد نے جواب دیا: "جی ہاں صاحب ان سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ ان کے سب سے ہونہار شاگرد ہیں۔ اور خان صاحب بھی بڑے ادب اور نرمی و سادگی سے ان کا ہر حکم سنتے اور بجا لاتے تھے۔ جب ان کی طبیعت ہوتی تو وہ مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیا کرتے تھے۔ کہو آزاد صاحب کا موڈ کیسا ہے ان کا جیسا موڈ ہوتا میں بتا دیا کرتا تھا۔ جب اس میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی تو کوئی کے تمام درد و دیوار کو فوراً پتہ چل جاتا تھا۔"

قائد اعظم اپنے ملازمین کے کردار و اطوار کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جیسے طرح

اُن کو تن کے میل سے نفرت تھی۔ اسی طرح وہ سن کے میل سے متنفر تھے۔ مطلوب اُن کو بہت پسند تھا۔ مگر جب اُن کو معلوم ہوا کہ وہ ایک رضا کار لڑائی سے محبت کی پیشین گوئی کر رہا ہے تو ان کو بہت کوفت ہوئی۔ مگر وہ اس قسم کی کوفت زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتے تھے۔ اُس کی طلب ہوئی اور فوراً غارِ مست سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مگر اس کو نصرت کرنے کے بعد وہ اُس سے اس طرح پیش آئے جس طرح دوستوں سے آتے ہیں۔

آزادیوں کرتا ہے، ایک بار میں رات کے دو بجے میری تفریح سے سب اسخ ہو کر کوٹھی آیا۔ وہ دن ایسے تھے۔ جب رگوں میں جہانی کے خون کو کھولانے میں ایک عجیب قسم کی لذت محسوس ہوا کرتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ صاحب کو میرے دیر سے آنے کا جہلم تک ڈھونڈ رہا ہوگا۔ مگر ان کو کسی دکھی طرح پتہ چل گیا۔ دوسرے روز کا مجھے طلب فرمایا۔ ادھر انگریزی میں کہا کہ تم اپنا کیریئر خراب کر رہے ہو۔ پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں ارشاد ہوا۔ "ول، اب ٹیڈا شادی بننے لگے گا۔" چنانچہ چار ماہ بعد جب وہ بیٹی سے وہی اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے۔ تو ان کی بہت کے مطابق میری شادی ہو گئی۔ اور میری خوش قسمتی ہے کہ محض ان کی وجہ سے میرا گذشتہ سادات خاندان میں ہوا۔ وہ نہ میں تو شیخ تھا۔ لڑکی دلوں نے مجھے اس لئے قبول کیا کہ آزاد قائد اعظم کا غلام ہے۔

میں نے آزاد سے دفتر ایک سوال کیا۔ کیا تم نے کبھی قائد اعظم کے منہ

سے آئی ایم سوری سنا تھا :

آزاد نے اپنی سوئی تنومند گردن زور سے نفی میں ہلائی : " نہیں — کبھی نہیں — پھر وہ مسکایا : " اگر اتفاق سے کبھی آئی ایم سوری ان کے منہ سے نکل جاتا تو مجھے یقین ہے کہ کوشنری میں سے یہ الفاظ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شاد دیتے : " میرا خیال ہے آزاد کے اس بے ساختہ جملے میں قائد اعظم محمد علی جناح کا پورا پورا کردار آجاتا ہے ۔

محمد یحیٰ آزاد زندہ ہے ، اس پاکستان میں جو اس کے قائد اعظم نے اسے عطا کیا ہے اور جو اب اس کے ہونہار شاگرد خان یاقوت علی خان کی قیادت میں دنیا کے نقشے پر زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہا ہے ۔ اس آزاد خطہ زمین پر آزاد پنجاب آرٹ پکچرز کے دروازے کے باہر پان وائے کی دکان کے پاس ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھا اکثر اپنے آقا کا منتظر رہتا ہے ۔ اور اس اچھے وقت کے لئے دست بدعا رہتا ہے جب وقت پر اس کی تحراہ مل جایا کرے ۔ اب وہ قائد اعظم کی تعین کے مطابق ہندوستان کے لئے بھی تیار ہے ۔ بشرطیکہ اس کو اس کا موقع دیا جائے ۔

وہ بے حد متفکر تھا ، جب میں نے اس سے قائد اعظم کی زندگی کے بارے میں اس کے اثرات کے تعلق استفسار کیا ۔ اس کے پاس پانی کے لئے بھی پیسے نہیں تھے ۔ میں نے جب اس کے تفکرات اصرار دھر کی باتوں سے کسی قدر دور کئے تو اس نے ایک آہ بھر کر کہا : " صاحب احتمال فرمائیں — کاش ان کے اس سفر میں میں



مجی شریک ہوتا۔ ان کی سفید اوپن پیکارڈ ہوتی، اس کا وہیل میرے ہاتھوں میں ہوتا، اور میں آہستہ آہستہ ان کو مٹرلی مقصود تک لے جاتا۔ ان کی نازک طبیعت دھچکوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے سنا ہے واسٹا اعلیٰ درست ہے یا غلط جیب ان کا جہاز کراچی ایئر وڈروم پر پہنچا تو ان کو گورنمنٹ آؤسٹن کمپنی چانے کے لئے جوائنٹس تھی اس کا انجن درست حالت میں نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر چل کر رگ گئی تھی۔ اس وقت میرے صاحب کو کس قدر کوفت ہوئی ہوگی !

آزاد کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تھے ۔

---

## آغا حشر سے دو ملاقاتیں

تاریخیں اور سن مجھے کہیں یاد نہیں رہے، یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون لکھتے وقت مجھے کافی الجھن ہو رہی ہے۔ خدا معلوم کون سا سن تھا۔ اور میری عمر کیا تھی، لیکن صرف اتنا یاد ہے کہ بعد شکل انٹرنس پاس کر کے اور دو دفعہ ایف اے میں فیل ہونے کے بعد میری طبیعت پڑھائی سے بالکل اچاٹ ہو چکی تھی اور جوش سے میری دلپس دن بدن بڑھ رہی تھی۔ کسٹرو جیل سنگھ میں دینویا فیلڈ کھار کی دکان کے اوپر ایک بیٹیک تھی۔ جہاں دن رات جڑا ہوتا تھا۔ فلش کھیلے جاتی تھی بشروع ششہ میں تو یہ کھیل میری سمجھ میں نہ کیا۔ لیکن جب آگیا تو پھر میں اسی کا ہو رہا۔ رات کو جو تھوڑی بہت سونے کی فرصت ملتی تھی۔ اس میں بھی خواب راتوں راتوں اور تریوں ہی کے آتے تھے۔

ایک برس کے بعد مجھے سے گجے کچھ اکتا ہٹ ہوئے لگی۔ طبیعت اس بکری اور شعل چاہتی تھی۔ کیا؟ — یہ گجے سلوم نہیں تھا — دینویا فضلہ کبار کی ٹینک میں ایک روز ابراہیم نے جو کہ امرتسر سے پٹی میں تانگوں کا دارو فرماتے، آغا حشر کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ امرتسر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا تو گجے سکول کے وہ۔ ان یاد آگئے۔ جب تین چار مہینے در لنگھوں کے ساتھ مل کر ہم نے ایک ڈرامینک، کلب کھولی تھی۔ اور آغا حشر کا ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا تھا یہ کلب صرف پندرہ بیس روز قائم رہ سکی تھی۔ اس لئے کہ والد صاحب نے ایک روز احادیث بول کر ارمینیم اور طبلے سب توڑ پھوڑ دیے تھے۔ اور واضح الفاظ میں ہم کو بتا دیا تھا کہ ایسے راہبیاں شعل انہیں بالکل پسند نہیں۔

اس کلب کے باقیات آغا حشر کے اس ڈرامے کے چند الفاظ ہیں۔ جو میرے ذہن کے ساتھ ابھی تک چپکے ہوئے ہیں۔ "اتنا تھا اس کے کرم ہیں" میرا خیال ہے جب داروڈ ابراہیم نے آغا حشر کا ذکر کیا تو گجے اس وقت ڈرامے کا پورا ایکسپیرا یاد تھا چنانچہ گجے اس خبر سے ایک گوند دیسی پیدا ہو گئی کہ آغا حشر امرتسر میں ہے آغا صاحب کا کوئی ڈرامہ دیکھنے کا گجے اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ

دلت کو گھر سے باہر رہنے کی گجے قطعاً اجازت نہیں تھی۔ ان کے ڈرامے بھی میں نے نہیں پڑھے تھے۔ اس لئے کہ گجے سٹرٹ آف کرٹ آف لنڈن اور تریہ تھڈام فیروز پوری کے ترجمہ کردہ انگریزی جاسوسی ناول جیسی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا لیکن

اس کے باوجود امرتسر میں آغا صاحب کی آمد کی خبر نہ ملے کافی متاثر کیا۔  
 آغا صاحب کے متعلق بے شمار انہیں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کوچ و کیلاں  
 میں راکھتے تھے جو بھاری گلی تھی جس میں ہزار مکان تھا۔ آغا صاحب بہت بڑے  
 آدمی تھے۔ کٹھیری تھے، یعنی میرے ہم قوم — اور پھر میری گلی میں وہ کسی اپنے  
 بچپن کے ایام گزار چکے تھے۔ ان تمام باتوں کا لفظی اثر جو مجھ پر ہوا آپ اسے  
 بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

داروغہ ابراہیم سے جب میں نے آغا صاحب کے متعلق کچھ اور پوچھا تو اس  
 نے وہی باتیں بتائیں جو میں اوپر سے ہزار مرتبہ سن چکا تھا۔ کردہ پہلے دس بجے  
 کے عیاش ہیں۔ دن رات شراب کے نشے میں دھست رہتے ہیں۔ بے حد گندہ ذہن  
 ہیں۔ ایسی ایسی گالیاں اکیاد کرتے ہیں کہ غلطیات میں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔  
 بڑے سے بڑے آدمی کو بھی غلط میں نہیں ملتے — کہنی کے فلاں فلاں سیٹھ نے  
 جب ان سے ایک بار ڈرائے کا نقا منا کیا تو انہوں نے اس کو اتنی موٹی گالی دی جو  
 ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں آغا صاحب کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے کافی  
 تھی لیکن حیرت ہے کہ سیٹھ نے اُف نہ کی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا: 'آغا صاحب  
 ہم آپ کے نوکر ہیں۔' — جبریم گرتھے — ایک مرتبہ یہ ہرسل ہو رہی تھی مگر  
 کے باعث ایک ایکٹرس بار بار ماتھے پر سے انگلی کے ساتھ پسینہ پونچھ رہی  
 تھی۔ آغا صاحب جھنجھلائے اور ایک شعر موزوں ہو گیا۔

ابروہ سزاوار کروٹ جائے گی اُنکی

نادان ہو غوار سے کیلا نہیں کرتے

یہرسل ہو رہی تھی۔ لفظ ”فٹ“ ایک ایکٹرس کی زبان پر نہیں پڑھنا تھا۔ آغا صاحب نے گرج کر ”فٹ“ کا ایک ہم قافیہ لفظ لڑکا دیا — ایکٹرس کی زبان پر فوراً ”فٹ“ چڑھ گیا۔

آغا صاحب کے کان تک یہ بات پہنچی کہ ماسد یہ پردہ پگینڈا کر رہے ہیں کہ ہندی کئے ڈرائے ان کے اپنے کئے ہوئے نہیں کیونکہ وہ ہندی زبان سے باطلہ ناواقف ہیں آغا صاحب سیٹ پر ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے آئے اور حاضریں سے کہا: میرے تعلق چند مضامہ پرداز یہ بات پھیلا رہے ہیں کہ میں نے اپنے ہندی کے ڈرائے کرائے کے پنڈتوں سے لکھوائے ہیں — میں اب آپ کے سامنے شدھ ہندی میں تقریر کروں گا — چنانچہ آغا صاحب دد گھٹنے ہلکے ہندی میں تقریر کرتے رہے جس میں ایک لفظ بھی اردو یا فارسی کا نہیں تھا۔ آغا صاحب جس ایکٹرس کی طرف نگاہ اٹھاتے تھے وہ فوراً ہی ان کے ساتھ خلوت میں چلی جاتی تھی۔

آغا صاحب تھیٹر کو حکم دیتے تھے کہ تیار ہو جاؤ۔ اور شراب پی کر ٹھپتے ٹھپتے بیک وقت کو میڈی اور ٹریکڈی لکھوانا شروع کر دیتے تھے۔

آغا صاحب نے کبھی کسی عورت سے عشق نہیں کیا — لیکن مجھے داروغہ بہیم

کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ بات جھوٹ ہے۔ کیونکہ وہ امرتسر کی مشہور طوائف مختار پر عاشق ہیں۔ وہی مختار جس نے مصورت کو پیارِ ظلم میں ہیر و من کا پالٹ ادا کیا ہے۔

مختار کو میں نے دیکھا ہوا تھا۔ ہال بازار میں انور پٹیر کی دکان پر بیٹھ کر ہم قریب قریب ہر جمعرات کی شام کو مختار عورت داری کو نئے سے نئے فیشن کے کپڑوں میں بیوی دوسری طوائفوں کے ہمراہ ظاہر اپنی رنگا رنگ کی طرف جاتے دیکھا کرتے تھے۔

آغا صاحب شکل مصورت کے کیسے تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کچھ بھی نہ پتا تھا۔ تصویریں دیکھنے میں آئی تھیں۔ مگر ان کی چھپائی اس قدر وابہیات تھی کہ مصورت پہچانی ہی نہیں جاتی تھی۔ عمر کے متعلق صرف آغا معلوم تھا کہ وہ اب ضعیف ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں یعنی عمر کے آخری وقت میں ان کو مختار سے کیسے عشق ہوا۔ اس پر ہم سب کو جو دنیا فاضلوں کی ٹھیک میں جوا کھیل رہے تھے، ہنسنت تعجب ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے، مال کے پیسے نکالتے ہوئے دنیا فاضلوں کو کہا رہے کہ گردن ہٹا کر چڑھے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا، ”بڑھاپے کا عشق بڑا قاتل ہوتا ہے“

ایک بار آغا صاحب کا ذکر ٹھیک پر ہوا تو پھر قریب قریب ہر روز ان کی باتیں ہونے لگیں، ہم میں سے صرف دارودہا ابراہیم آغا صاحب کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ ایک روز اس نے کہا، ”کل رات ہم مختار کے کونٹے پر تھے۔ آغا صاحب کاڑھیکے کا سہارا لیے بیٹھے تھے۔ ہم میں سے باری باری ہر ایک نے ان سے چوڑھ در خواست کی کہ وہ اپنے نئے غم کو رائے ”رستم و سہراب“ کا کوئی قصہ سنائیں، مگر

انہوں نے انکار کر دیا۔ ہم سب یاروں سے ہر گئے۔ ایک نے مختار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آغا صاحب کی بغل میں بیٹھ گئی اور ان سے کہنے لگی: آغا صاحب! ہمارا حکم ہے کہ آپ رستم و سہراب سنائیں! — آغا صاحب سکڑائے اور بیٹے کو رستم کا پڑ زور مکار ادا کرنا شروع کر دیا۔ اللہ اللہ کیا گرج دار آواز تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا تیز دھارا پہاڑ کے پتھروں کو بہاٹے لئے جا رہا ہے!

ایک دن ابراہیم نے بتایا کہ آغا صاحب نے چنایک قلم ترک کر دیا ہے۔ جو آغا صاحب کے متعلق زیادہ جانتے تھے۔ ان کو بہت تعجب ہوا۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ فیصلہ انہوں نے حال ہی میں مختار سے مشق ہونے کی وجہ سے کیا ہے یہ عشق بھی کیا جلاتی۔ ہم مسجد نہ گئے۔ لیکن دینویا نفسوں نے نال کے کئی پیسے اپنے تہہ کے ٹب میں باندھتے ہوئے ایک بار پھر کہا: بڑھا چہ کے مشق سے خدا بچائے — بڑی غلام جیز ہوتی ہے۔

جوتے سے طبیعت اگتا ہی چلی تھی۔ میں نے شجک جانا آہستہ آہستہ چھوڑ دیا۔ اس دوران میں میری ملاقات باری صاحب اور حاجی فن فن سے ہوئی۔ جو روزنامہ مساوات کے ایڈیٹر مقرر ہو کر امرتسر آئے ہوئے تھے۔ پیچھے کے ہوٹل "شیراز" میں دونوں چاہیچینے آتے تھے اور ادب اور سیاست پر باتیں کرتے تھے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی۔ باری صاحب کو میں نے بہت پسند کیا۔ اسی دوران میں مجھے نے اختر شیرانی مرحوم کو مدعو کیا۔ دن رات ٹھہرے کے دور چلنے لگے۔ شعر و ادب سے

بہری دہی بڑھنے لگی۔ جو وقت پہلے غلش کھیلنے میں کھتا تھا اب مساوات کے فتر میں کھٹے لگا۔ کبھی کبھی باری صاحب ایک آدھ خبر ترجمے کے لئے مجھے دے دیتے جو میں ٹوٹی چوٹی انکو دے کر دیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے فلمی خبروں کا ایک کام سمجھال لیا۔ بعض دوستوں نے کہا کہ محض خرافات ہوتی ہے لیکن باری صاحب نے کہا: "بھلا اس کرتے ہیں۔ تم اب طبعزاد معنوں لکھنے شروع کرو۔"

طبعزاد معنوں تو مجھ سے کھسے نہ گئے۔ لیکن فرانسیسی ناول نگار کی ایک کتاب لاسٹ ڈیزائن کنڈ منڈ "میری اماری میں پڑی تھی۔ باری صاحب اٹھا کر لے گئے۔ دوسرے روز دوپہر کے قریب میں مساوات کے دفتر میں گیا تو کانٹوں سے معلوم ہوا کہ باری صاحب کو سرعام ہو گیا ہے۔ ایک کتاب صبح سے بلند آواز میں پڑھ رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہاں آتے ہیں۔ اور ایک ٹوٹا ٹھنڈے پانی کا سر پوڈ لاکر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ میں ادھر گیا تو دروازے بند تھے اور وہ خطیبانہ انداز میں انگریزی کی کوئی نہایت ہی زور دار عبارت پڑھ رہے تھے۔ میں نے دھشک دی۔ دروازہ کھلا۔ باری صاحب کہتے جیسے بیڑا بھر آئے۔ ہاتھ میں دکنس ہوگو کی کتاب تھی۔ اسے سری طرف بڑھا کر انگریزی میں کہا۔ "اٹ اڑ اسے دیری ہوٹ بکنا اور جب کتاب پڑھنے کی گرمی دُور ہوئی تو مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کا ترجمہ کروں۔"

میں نے کتاب پڑھی۔ لکھنے کا انداز بہت ہی موثر اور خطیبانہ تھا۔ خراب



ہی کر ترجہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر نظروں کے سامنے سطریں گڈمڈ ہو گئیں صمن میں ہنگ بھرا کر تھکے کی نے منہ میں سے کراہی بہن کو ترجہ کھوانے کی کوشش کی۔ مگر اس میں ناکام رہا آخر میں اکیسے بیٹھ کر دس پندرہ دنوں کے اندر اندہ ڈاکشتری سامنے رکھ کر سادی کتاب کا ترجہ کر ڈالا۔ باری صاحب نے بہت پسند کیا۔ اس کی اصلاح کی۔ ادریسوب حسن مالک اردو بک شال کے پاس تیس روپے میں کجرا دیا۔ یسوب حسن نے اسے بہت ہی قلیل عرصے میں چھاپ کر شائع کر دیا۔ اب میں صاحب کتاب تھا۔

”سادات؟ بند ہو گیا۔ باری صاحب لاہور کسی اخبار میں چلے گئے بیچے کا ہونٹل سٹما ہو گیا۔ میرے لئے کوئی شغل نہ رہا۔ کھنے کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ لیکن چونکہ دوکستوں سے داد ملتی تھی۔ اس لئے ادھر کوئی توجہ نہ دی۔ اب پھر دنیوا کبار کی بیٹھک تھی۔ جوا کھیلتا تھا۔ مگر اس میں اب وہ پہلا سا لطف اور پہلی سی حرارت نہیں تھی۔“

ایک دن دارودقہ ابراہیم نے فلش کھیلنے کے دوران میں بتایا کہ آغا حشر کرائے ہوئے ہیں اور ممتاز کے یہاں مٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے کہا، کسی روز مجھے وہاں سے چلو۔ ابراہیم نے وعدہ تو کر لیا مگر پورا نہ کیا۔ جب میں نے تقاضا کیا تو اس نے یہ کہہ کر فرغ دیا، ”آغا صاحب لاہور چلے گئے ہیں۔“

میرا ایک دوست تھا بری لکھو، اللہ بخشے خوب آدمی تھا۔ پانچ مکان بیچ کر

دوسرے سارے یورپ کی سیر کر چکا تھا۔ اور ان دنوں چھٹے اور آخری مکان کو آہستہ آہستہ بڑے سیلنے کے ساتھ کھا رہا تھا۔ فرانس میں صرف چھ مہینے رہا تھا۔ لیکن فرانسیسی زبان بڑی بے تکلفی سے بول لیتا تھا۔ بہت ہی ڈبلا پیلا، مرل سا انسان تھا مگر بلا کا پھر تیل چرب زبان اور دھانسو یعنی برے کی طرح اندر دھنسا جاتا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے آغا حشر کا ذکر کیا۔ اس نے فوراً ہی پوچھا: کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا: بہت دیر سے میری خواہش ہے کہ ان کو ایک نظر دیکھوں۔ ہری سنگھ نے فوراً ہی کہا: ”اس میں کیا مشکل ہے۔ جب سے وہ یہاں امرتسر میں پنڈت مسن کے ہاں مقیم رہا ہے، قریب قریب ہر روز میری اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں اچھل پڑا: تو ہری کل شام کو تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔ ہری نے اپنا دلکی کا گلاس اپنے پتلے ہونٹوں سے لگایا اور بڑی نزاکت سے ایک چوڑا سا گھونٹ بھر کے فرانسیسی زبان میں کچھ کہا۔ جس کا مطلب تھا: ”یقیناً میرے دوست؟“

اور ہری سنگھ دوسرے روز شام کو مجھے آغا حشر کا شمیری کے پاس لے گیا۔ پنڈت مسن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کشمیری پنڈت تھے۔ نام ان کا بدلنے کیا تھا۔ مسن ان کا تخلص تھا۔ مشاعروں میں پرانی وقیا نوسی شاعری کے نمونے کے طور پر پیش ہوتے تھے۔ آپ کا کاروباری تعلق کھٹرو گھنٹیاں کے امرت سبھا سے تھا۔ آغا صاحب سے پنڈت جی کی دوستی معلوم نہیں شاعری کی وجہ سے تھی یا

سینا کی وجہ سے یا کٹڑہ گھنٹیاں اس کا باعث تھا جس میں امرت سینا اور مختار کا بالاناخانہ بالکل آسنے سا سنے گئے۔ بسبب کچھ بھی ہو، آغا صاحب پنڈت حسن کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور جیسا کہ مجھے ان کی باہم گفتگو سے پتا چلا، دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف تھے۔

پنڈت حسن کی بیٹھک یا دفتر کٹڑہ گھنٹیاں کے پاس پشیم واسے بازار سے نکل کر آگے جہاں سبزی کی دکانیں شروع ہوتی ہیں۔ ایک بڑی سی ٹیوڈھی کے اوپر واقع تھا۔ ہری سنگھ کے تھا۔ میں اس کے چھپے بیٹھکیاں چڑھتے وقت میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں آغا حشر کو دیکھنے والا تھا۔

باہر صحن میں گریسوں پر کچھ آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں تخت پر پنڈت حسن بیٹھے گڑ گڑی پی رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک عجیب و غریب آدمی میری نگاہوں سے ٹکرایا۔ پہنچتے ہوئے لال رنگ کی چمکدار ساٹن کا لاپا، دو گھوڑے کی بوسکی کی کالروالی سفید قمیض، کمرہ بھرے نیلے رنگ کا پتہ نون والا آزاد بند بڑی بڑی بے سنگم آنکھیں — میں نے سوجا کٹڑہ گھنٹیاں کا کوئی پیر ہوگا۔ لیکن فوراً ہی کسی نے اس کو آغا صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ مجھے دھکتا سا لگا۔

ہری سنگھ نے بڑھ کر اس عجیب و غریب آدمی سے مصافحہ کیا، اور میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا: "میرے دوست سعادت حسن مثوں آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔"

آغا صاحب نے اپنی بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں میری طرف گھمائیں اور سکر کر کہا: "لارڈ مٹو سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"  
میں تو جواب نہ دے سکا۔ لیکن ہری سنگھ نے کہا: "آپ بیٹو نہیں ہیں مٹو ہیں۔ کشمیری۔"

آغا صاحب نے ایک لمبی "اوہ" کی اور پنڈت حسن سے کشمیریوں کی آل کے متعلق طویل گفتگو شروع کر دی۔ میں پس پس بچ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی کو قطعاً آغا صاحب کی اس گفتگو سے دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بار بار ان سے کہتے تھے: "آغا صاحب! اس کو چھوڑیے یہ بتائیے کہ آپ کب میرے لئے دو ریل کا مزاجیہ ڈر اور لکھیں گے؟"  
آغا صاحب کو اس مزاجیہ ڈرانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گفتگو تو کشمیریوں کی آل کے بارے میں کر رہے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ داغ کچھ اور ہی سوچ رہا ہے ایک دوبار انہوں نے دورانِ گفتگو میں اپنے نوکر کو سوٹی موٹی لگائیں دے کر یاد کیا کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔

آغا صاحب جب خاموش ہوئے تو پنڈت حسن نے ان سے کہا: "آغا صاحب! اس وقت آپ کی طبیعت موزوں ہے۔ میں کاغذ قلم لاتا ہوں آپ وہ کو میڈی لکھو اننا شروع کر دیجئے؟"

آغا صاحب کی ایک آنکھ جینگی تھی۔ آپ نے اسے گھما کر کچھ عجیب انداز سے پنڈت جی کی طرف دیکھا: "اے چپ کر! آغا حشر کی طبیعت ہر وقت موزوں ہوتی ہے۔"

پنڈت جی خاموش ہو گئے اور اپنی گود گڑی گود گزارنے لگے۔ دفتہ عجے عسوس  
 ہوا کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔ تیز خوشبو کے جبکے آرہے تھے۔ میں نے دیکھا آغا صاحب  
 کے دونوں کانوں میں حطر کے پھوٹے پھوٹے ہوئے تھے۔ اور غائباً سر بھی عطری  
 سے چڑا ہوا تھا۔ میں کچھ تو اس تیز خوشبو اور آغا صاحب کے لاپے اور آزار بند کے  
 شمع رنگوں میں قریب قریب غرق ہو چکا تھا۔

بازار میں دفتہ شور و غل برپا ہوا۔ ایک صاحب نے اٹھ کر یا ہر جہانکا اور  
 آغا صاحب سے کہا: "آغا صاحب تشریف لائیے۔ ہندی کا جلوس آرہا ہے۔"  
 آغا صاحب نے کہا: "کجواس ہے۔ اور حادثہ کر بلا پر نہایت ہی نقصان لکھ  
 دینا شروع کر دیا۔ ایسے ایسے نکتے نکالے کہ سب دھمک رہ گئے آخر میں بڑے  
 ڈرامائی انداز میں کہا: "دجلے کا منہ بند تھا۔ قرات خشک پڑی تھی۔ پیٹنے کو پانی کی  
 ایک بوند نہیں تھی۔ ہندی گوندھی کس سے گئی۔ آغا حشر..... اس  
 سے آگے کہتے کہتے رک گئے۔ ایک صاحب جو غالباً شیوے تھے۔ مجلس سے اٹھ کر  
 چلے گئے۔ آغا صاحب نے موضوع بدل دیا۔

پنڈت عمن کر مرقہ ملا چنانچہ انہوں نے پھر درخواست کی: "آغا صاحب  
 دوریل کی کامیڈی آپ کو کھنی ہوگی؟"

آغا صاحب نے یہ موٹی گالی دینی: "کامیڈی کی..... یہاں ٹیریڈی کی  
 باتیں ہر وہی تھیں اور تم اپنی کامیڈی لے آئے ہو؟ یہ کہہ کر آغا صاحب نے حادثہ کر بلا

آغا شہر سے دو ملاقاتیں

کے بارے میں پھر عالمانہ انداز میں بحث شروع کر دی۔ کیونکہ وہ جی بھر کے اس موضوع پر اپنی معلومات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکے تھے۔ مگر فوراً جانے کیا جی میں آئی کہ ایک دم اپنے نوکر کو گالیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔ چنانچہ وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اذہر اذہر کی باتیں شروع ہوئیں۔ کسی نے آغا صاحب سے مولانا ابوالکلام کے تجربہ علم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کا جواب کچھ یوں دیا: ”علی الدین کے متعلق پوچھتے ہو۔ ہم دونوں اکٹھے امریکی اور عیسائی سینٹوں سے مناظرے کرتے رہے ہیں۔ گھنٹوں پاگلا مچاڑتے تھے عجیب دن تھے وہ بھی“

یہ کہہ کر آغا صاحب لاپے اور آزار بند کے بھڑکیے رنگوں اور کانوں میں اڑے ہوئے چوٹے اور سر میں چڑے ہوئے عطر کی تیز خوشبو سمیت بیٹے ہوئے دنوں کی یاد میں کچھ عرصے کے لئے کھو گئے۔ آپ نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں بند کر لیں جہاں نہایت آپ نے نہ مارا کھیلتی۔ اس سے گواہ زندگیوں کے پیر دکائی دیتے تھے۔ لیکن ان کا چہرہ بہت ہی بادمب تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ جھکے ہوئے پپڑوں کی جھریوں والی پتلی جلد کے نیچے موٹی موٹی کانچ کی گریاں — حرکت کر رہی تھیں۔ انہوں نے جب آنکھیں کھولیں تو میں نے سوچا کتنے برسوں کا نشان پر نمودار ہے۔ کس قدر سُرخی ان کے ڈوروں میں جذب ہو چکی ہے

آغا صاحب نے پھر کہا: "عجب دن تھے وہ — آزاد ڈھیل کے بیچ لڑتے  
 کا مادی تھا جے آتا تھا مزہ کینچ کے بیچ لڑانے میں۔ ایک ہتھ مارا۔ اور مٹا کٹ  
 یا۔ حریت منہ دیکھتے رہ گئے۔ ایک دفعہ آزاد بہت بُری طرح گھر گیا۔ مت بد  
 چار نہایت ہی ہٹ دھرم عیسائی مشنریوں سے تھا۔ میں پہنچا تو آزاد کی جان  
 میں جان آئی۔ اس نے ان مشنریوں کو میرے حوالے کیا۔ میں نے دو تین ایسے  
 لڑکے دیئے کہ پوچھلا گئے۔ میدان ہمارے ہاتھ میں رہا۔ لیکن میرا حلق سوکھ  
 گیا۔ قیامت کی گرمی تھی بسجدہ دوزخ بنی ہوئی تھی۔ میں نے آزاد سے کہا: وہ  
 بڑا قتل کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا: "میری جیب میں ہے۔" میں۔ کہا خدا کے  
 لئے چلو۔ میرا حلق سوکھ کے کھڑی ہو گیا ہے؟ دور جانے کی تار۔ نہیں تھی۔  
 وہیں مسجد میں ایک غسل خانے کے اندر جھک مارنی پڑی۔"

استغنی میں آغا صاحب کا نوکر آگیا۔ آغا صاحب نے اپنے مخصوص نماز  
 میں اس کو گایا دیں اور وہ پوچھی کہ اس نے اتنی دیر کیوں کی۔ نوکر نے جو گایا  
 کا مادی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بٹنڈل نکالا اور کھول کر آگے بڑھایا۔ "ایسی چیز لایا  
 ہوں کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے۔"

آغا صاحب نے کھلا ہوا بٹنڈل ہاتھ میں لیا۔ شہ رخ رنگ کے چادر لارینڈ  
 تھے آغا صاحب نے ایک نظر ان کو دیکھا اور انھوں کو بہت ہی خوفناک انداز میں اوپر  
 اٹھا کر اپنے نوکر پر گرے۔۔۔۔۔ یہ چیز لایا ہے تو۔۔۔۔۔ ایسے واہیات ازارینڈ

آغا حشر سے دو عطا تھیں

تو اس شہر کے کھنڈے بھی نہیں پہنتے :- یہ کہہ کر انہوں نے نپٹل فرش پر دسے مارا۔  
کچھ دیر زکریا پر بسے، پھر جیب سے غالباً دو تین تھرا روپے کے نوٹ نکالے اور  
اسے حکم دیا :- ”جاؤ، پان لاؤ :-“

پنڈت عمن نے گڑگڑی ایک طرف رکھی اور کہا :- ”نہیں نہیں آغا صاحب،  
میں شگرتا ہوں :-“

آغا صاحب نے سب نوٹ تماشہ بینوں کے انداز میں اپنی جیب میں رکھے  
اور کہا :- ”جاؤ تیار رہے پاس کچھ باقی بچا ہوا ہے :-“

نوکر جلنے لگا تو انہوں نے اسے روکا :- ”ٹھہرو — وہاں سے چتا بھی جلتے  
اؤ گروہ ابھی تک کیوں نہیں آئیں :-“

نوکر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیڑھیوں کی جانب سے جکی سی جھلک آئی پھر  
ریشمیں سرسراہٹیں سنائی دیں — آغا صاحب کا چہرہ بشارت ہو گیا — منار  
جو ہرگز ہرگز حسین نہیں تھی، خوش وضع کپڑوں میں ملبوس عمن میں داخل ہوئی —  
آغا صاحب اور حاضرین کو تسکینات عرض کی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ آغا صاحب  
کی آنکھیں اس کرواں تک چھوڑنے لگیں ۔

استغنیہ میں پان آگئے۔ جو اخبار کے کاغذ میں پلٹے ہوئے تھے۔ نوکر اندر چلا تو  
آغا صاحب نے کہا :- ”کاغذ پھینکنا نہیں سبھال کے رکھنا :-“

میں نے ایک دم حیرت سے پوچھا :- ”آپ اس کاغذ کو کیا کریں گے آغا صاحب :-“



آغا صاحب نے جواب دیا: پڑھوں گا۔ چپے ہوئے کا غذا کوئی بھی کھڑا ہو  
بچے بلا ہے میں نے ضرور چمکا ہے! یہ کہہ کر وہ اٹھے: "معافی چاہتا ہوں! اندر ایک  
مشتوق میرا انتظار کر رہا ہے۔"

پنڈت عمن نے گرد گزری اشائی اور اُسے گرد گڑانے لگے۔ میں اور ہری سنگھ  
تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے چل دیئے۔

میں کئی دنوں تک اس ملاقات پر غور کرتا رہا۔ آغا صاحب عجیب و غریب نرار  
پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ان کے چند ڈھانچے پڑھے جو اعلیٰ طاسے  
پڑتے اور نہایت ہی ادنیٰ کا غنڈہ پرچھے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں کو میدی آتی تھی  
وہاں چکڑیں ملتا تھا۔ گورامائی مقاموں پر مقابلہ بہت ہی زوردار تھا۔ بعض اشعار  
سوتیلانہ تھے، بعض نہایت ہی لطیف۔ سب سے پُر لطف بات یہ ہے کہ ان گڑلوں  
کا موصوفہ طوائف تھا۔ جن میں آغا صاحب نے اس کے وجود کو سوسائٹی کے  
حق میں زبردست کیا تھا۔ . . . اور آغا صاحب عمر کے اس آخری جھٹکے میں شراب  
چھوڑ کر ایک طوائف سے بہت پُر جوش عشق فرما رہے تھے۔ پنڈت عمن  
سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا: "عشق کے تعلق تو میں نہیں جانتا  
لیکن ترک شراب نوشی بہت جلد ان کو لے کرے گی۔"

آغا صاحب تو کچھ دیر زندہ رہے۔ لیکن پنڈت عمن یہ فرمانے کے تقریباً ایک  
ماہ بعد اس دنیا سے چل بے۔

میں نے اب مختلف اخباروں میں کھنا شروع کر دیا۔ چند ہیے گزر گئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ آغا حشر لاہور میں 'رستم و سہراب' نام کی ایک فلم بنا رہے ہیں جس کی تیاری پر دو سو پانچ لاکھ روپے کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اس فلم کی ہیر دوشی جیسا کہ ظاہر ہے مختصر تھی۔

اسے دوسرے لاہور صرف ایک 'نقشے' کا سفر تھا۔ آغا صاحب سے پھر ملنے کو جی تو بہت چاہتا تھا مگر غلط معلوم ایسی کرن سی کا ڈنک تھا کہ لاہور جانا ہی نہ ہو سکا۔ بہت دنوں کے بعد باری صاحب نے جلاوطنی میں لاہور گیا۔ وہاں پہنچ کر کچھ ایسا مشغول ہوا کہ آغا صاحب کو بھول ہی گیا۔ شام کے قریب ہم نے سوچا کہ چلو اردو بکسٹل چلیں۔ چنانچہ میں اور باری صاحب دونوں عرب ہوٹل سے چائے پی کر ادھر روانہ ہوئے۔ اردو بکسٹل پہنچے تو میں نے دیکھا کہ صاحب بے سبب کی میز کے پاس کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں نے باری صاحب کو بتایا کہ آغا حشر ہیں۔ انہوں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ یہ ہیں آغا حشر باری! آغا صاحب کا لباس اسی قسم کا تھا جسے بوسکی کی قیغی، گہرے نیلے رنگ کا ریشمی لاجپا۔ سر سے نیلے بیٹھے ایک کتاب کی رون گردانی کر رہے تھے۔ پاس پہنچا تو ایک دم سیرادل دھڑکنے لگا کیونکہ آغا صاحب کے ہاتھ میں میری ترجمہ کی ہوئی کتاب 'مرکز شہ' اسیر تھی۔

بے سبب نے اٹھ کر میرا اور باری کا آغا حشر سے تعارف کرایا اور کہا: 'یہ کتاب جو آپ دیکھ رہے ہیں مسٹر منٹو کی ترجمہ کی ہوئی ہے! آغا صاحب نے اپنی مرئی مرئی آنکھوں سے مجھے دیکھا میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پہچان لیں گے۔' میسکن

انہوں نے مجھے دیکھنے کے بعد کتاب کے چند اوراق پلٹے اور کہا: "کیسا کھٹے والا ہے وکٹر ہیوگو؟"

باری صاحب نے جواب دیا: "فرانسیسی ادب میں وکٹر ہیوگو کا رتبہ بہت بلند ہے۔"

آغا صاحب درق پلٹتے رہے: "ڈراماٹ تھا؟"

اب کی بار پھر باری صاحب نے جواب دیا: "ڈراماٹ بھی تھا۔"

آغا صاحب نے پوچھا: "کیا مطلب؟"

باری صاحب نے انہیں بتایا: "وگٹر ہیوگو اصل میں شاعر تھا۔ غزلیں کی دہائی تحریک کا اہم۔ اس نے ڈرامے اور ناول بھی لکھے۔ ایک ناول مصیبت زدہ آنا ظہور ہوا۔ کہ اس کی شاعری کو لوگ قبول کئے اور اسے ناولسٹ کی حیثیت سے جاننے لگے۔ آغا صاحب یہ معلومات بڑی دہپے سے سنتے رہے۔ آخر میں انہوں نے میسرے سے کہا: "سرگزشت ایسٹرن بھی ان کتابوں میں شامل کر لی جائے جو وہ خرید رہے تھے میں بہت خوش ہوا۔"

اس کے بعد باری صاحب سے باتیں کرتے کرتے اٹھے اور اندر شوروم میں چلے گئے۔ باری صاحب کی گفتگو سے آغا صاحب متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے باری صاحب کی سفارش پر کئی کتابیں خریدیں۔ اس دوران میں باری صاحب نے ان سے کہا: "آغا صاحب آپ ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ کیوں نہیں لکھتے ایسی

کتاب کی اشد ضرورت ہے ؟

آغا صاحب نے جواب دیا : ایسی کتاب صرف آغا حشر ہی لکھ سکتا ہے اس کا ارادہ بھی تھا، مگر وہ کم بخت آج کل قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے ۔ اس کے دروازے پر موت دستک دے رہی ہے ؟

میں نے ان سے پوچھا : آغا صاحب، آپ کے ڈرامے جو بازار میں بکتے ہیں ؟ میں نے ابھی اپنا جلد پورا بھی نہ کیا تھا کہ آغا صاحب نے جلد آواز میں کہا ...  
”لا حول ولا ... آغا حشر کے ڈرامے اور ... سے چیتروں پر چھپیں — بغیر اجازت کے، ادھر ادھر سے سننا کر چھاپ دیتے ہیں ؟ اس کے بعد انہوں نے بہت ہی موٹی گالی ان پیشروں کو دمی۔ جنہوں نے ان کے ڈرامے چھاپے تھے۔

میں نے ان سے کہا : آپ ان پر دھڑی دائر کیوں نہیں کرتے ؟  
آغا صاحب ہنسنے لگا : کیا وصول کروں گا۔ ان ٹٹ پر پنجیوں سے ؟  
بات درست تھی : میں خاموش ہو گیا۔

آغا صاحب نے باہر آکر میسوب سے بل طلب کیا اور جیب سے تلاش نہیں کے انداز میں تین چار ہزار روپے کے بالکل نئے نوٹ نکالے، ان دنوں دس دس اور پانچ پانچ کے نئے نوٹ نکلتے تھے جو پہلے نوٹوں کی بہ نسبت چھوٹے تھے۔  
آغا صاحب نے بتایا کہ چیک کیش کرانے کے لئے جب بنک گئے تو وقت ہو چکا تھا۔  
آپ نے کوک سے کہا : آغا حشر کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا۔ جلدی چیک کیش کرواؤ

لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ آغا حشر ہیں تو وہ بھاگتا ہوا بینچر کے پاس گیا۔ فوراً ہی بینچر دوڑا دوڑا ان کے پاس آیا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ نئے نوٹ منگو کر اس نے بڑے ادب سے آغا صاحب کو پیش کیئے اور کہا "میں آپ کی اور کوئی سیوا تو نہیں کر سکتا۔ یہ نئے نوٹ آئے ہیں، سب سے پہلے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

باری صاحب نے ایک نوٹ آغا حشر صاحب سے لیا اور اس کو انگلیوں میں پکڑ کر کہا: "آغا صاحب گرفت کچھ کم ہو گئی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی گرفت کچھ کم ہو گئی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی سہیں آغا صاحب نے اسی فقرے کی بہت داد دی: "خوب بہت خوب ..... گرفت کچھ کم ہو گئی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی سہیں ڈرا سہیں اسے ضرور استعمال کروں گا۔"

باری صاحب بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں وہ نوکر آیا وہی جو پنڈت من کے دفتر میں ازار بند لایا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چار قند حارسی ازار تھے آغا صاحب نے ایک ازار یا ناک بٹوں چڑھا کر گالی دی — نہایت ہی واہیات انداز میں: "نوکر نے پرچھا: واپس کر آؤں؟"

آغا صاحب بولے: "نہیں بے۔ تو کھائے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک وزن ہار گالی دھکا دی۔"

آغا صاحب جانے لگے تو میں نے آؤ گرات تک نکال کر ان کے دستخط لٹے۔

آغا حشر سے دو ملاقاتیں

آغا صاحب جب کانپتے ہوئے اٹھتے اپنا نام کھچے تو کہا — ایک زمانے کے بعد میں نے یہ چند حرف لکھے ہیں۔

میں امرتسر میں آیا کچھ عرصے کے بعد یہ خبر آئی کہ لاہور میں مختلف حالات کے بعد آغا حشر کا شمیری کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازے کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے دنیویا لعلو کہا رکی ٹھیک پر جب آغا صاحب کی موت کا ذکر ہوا تو اس نے نال کے پیسے نکال کر اپنی مالی دار ٹرپی میں رکھتے ہوئے بڑے ہی غصیانہ انداز میں کہا: بڑھاپے کا مشق بہت خالم ہوتا ہے۔

آغا حشر

## اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں

خدا معلوم کتنے برس گزر چکے ہیں۔ حافظہ اس قدر کمزور ہے کہ نام، سن اور تاریخ کبھی یاد ہی نہیں رہتے۔ امرتسر میں غازی عبدالرحمن صاحب نے ایک روز اضافہ پرچہ مسامحت جاری کیا۔ اس کی ادارت کے لئے باری علیگ (مرحوم) اور ابراہیم علاء حشمتی (صعافی) (صاحبی حق حق) بلائے گئے۔ ان دنوں میری آوارہ گردی سراج پرستی بے مقصد سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ دماغ بے مد منتشر تھا۔ اس وقت قریم نے محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دماغی انتشار میرے لئے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لئے بے تاب تھا۔

جیسے کے برٹل (شیراز) میں قریب قریب ہر روز گپ باری کی محفل جمی تھی۔ بالا، انور پٹیل، عاشق، نوڈر، گرافر، فقیر حسین سلیس اور ایک صاحب جن کا

کے قریب

نام میں بھل گیا ہوں۔ باتا دہلی کے ساتھ اس محل میں شریک ہوتے تھے، ہر قسم کے برصغیر  
زیر بحث لائے جاتے تھے، بالآخر غرض گراؤ پر کسی نوجوان صاحب  
اگر وہ غیر حاضر ہوتا تو محل سوتی رہتی، شعر بھی کہتا تھا، اس کا ایک شعر  
ابھی تک مجھے یاد ہے۔

اشک مرگاں پہ ہے اک سا گیا

نوک سی چمکے گئی ہے چھالے میں

مجھے سے لے کر انور پنیر تک سب موسیقی اور شاعری سے شغف  
رکھتے تھے، وہ صاحب جن کا نام میں بھول گیا تھا، کیپٹن وحید تھے نیلی  
نیلی آنکھوں والے سب سے بڑے، مضبوط جسم، آپ کا محبوب مشعل گوریل سے  
لڑتا تھا، چنانچہ کئی گورے ان کے ہاتھوں پٹ چکے تھے، انگریزی بہت  
اچھی بولتے تھے اور طبلہ، ہر بلبلوں کی طرح بجاتے تھے۔

ان دنوں جیسے کے ہوٹل میں ایک شاعر اختر شیرانی کا بہت چرچا تھا،  
قریب قریب ہر محفل میں اس کے اشعار پڑھے یا گائے جاتے تھے، جیسا عزیز، عام  
طور پر ہم اپنے عشق میں سب کچھ تباہ کر دیں گے، بہت عکس ہے کہ یہ مصرع  
غلط ہو گیا کرتا تھا، یہ نئے قسم کا جذبہ سب کے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا، عشق  
کو جو دھکی دی گئی تھی سب کو بہت پسند آئی تھی۔

جیسا تر اختر شیرانی کا دیوانہ تھا، کائنات کے پاس کھڑا کہکشاں سے بل واصل کر



راہ ہے اور گلشنِ راہ ہے : اسے عشق کہیں لے چلے ۔ مسافروں کو کمرے دکھا رہا ہے اور بربوب گار رہا ہے : کیا گنجز جانے گا رہ جاؤ یہیں رات کی رات ؟  
عاشق (فرزگر) فری آواز گو بہت تہی تھی ۔ لیکن وہ اسے عشق کہیں لے چلے ۔  
بڑے سوز سے گایا کرتا تھا میں نے جب بھی اس کے منہ سے یہ نظم سنی ۔ مجھ پر بہت اثر ہوا ۔ اس زمانے میں چڑک طبیعت میں انتشار تھا ۔ اس لئے یہ نظم مجھے اپنے کمنہ صول پر آشکار دُور ۔ بہت دُور اُن دیکھے عزیزوں میں لے جاتی تھی ۔

آسان دانا بیت چمکے ہے گردہ کیفیت جو اس وقت مجھ پر طاری ہوتی تھی میں اب بھی عوس کر سکتا ہوں ۔ حبیبِ دُورِ ب کیفیت تھی ۔ پیچھے کے ہوٹل کے بہت اندر اندھیری گڑبگڑ کی کوٹھڑی میں بیٹھا میں یوں عوس کرتا کشتی میں بیٹھا ہوں ۔  
پریاں اسے کھے رہی ہیں ۔ نازک پردوں والی ۔ پریاں ۔ رات کا وقت ہے اس لئے مجھے ان پردوں کا صرف سایا سا نظر آتا ہے ۔ سمندر پر سکون ہے ۔ کشتی جھک رہی ہے ۔ کھائے بیٹھ چل رہی ہے ۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف ۔ باپوں کی بستی بہت پیچھے رہ گئی ہے ۔ ہم دینی شور و غل سے ہزاروں میل آگے بڑھ گئے ہیں ۔

مجھے کے ہوٹل میں کچھ عرصے کے بعد باری صاحب اور چشتی صاحب کا آنا جانا بھی شروع ہو گیا ۔ دونوں کھانا کھاتے یا چاہ پیتے اور چلے جاتے ۔ مگر جب مجھے کو معلوم ہوا کہ وہ اخباری آدمی ہیں تو فوراً ان سے بے تکلف مراسم پیدا کر لیے ۔

باری صاحب اختر شیرانی کے کلام سے واقف تھے لیکن ذاتی طور پر شاعر کو نہ

جانے تھے چشتی صاحب ایک مدت کے بعد بغداد اور مصر وغیرہ کی سیاحت کے بعد تازہ تازہ واپس آئے تھے۔ اس لئے وہ یہاں کے شعراء کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ پھر بھی جب انہوں نے مجھے سے اختر شیرانی کا کلام سنا تو بہت متاثر ہوئے۔

اس دوران میں باری صاحب کے ساتھ گھل مل گیا۔ اُن کی سنجیدگی اور متانت بھری طراقت مجھے بہت پسند آئی۔ میرے ذہنی اخبار کو بھانپ کر انہوں نے مجھے صحافت کی طرف مائل کیا۔ آہستہ آہستہ ادب سے روشناس کرایا۔ پہلے میں تیرتھ رام فیروز پوری کے مائل پڑھا کرتا تھا۔ اب باری صاحب کی وجہ سے اسکروائل اور وکٹر جوگر سے زیر مطالعہ رہنے لگے۔ جوگر مجھے بہت پسند آیا۔ بعد میں میں نے محسوس کیا کہ اس فرانسیسی مصنف کا خطیبانہ انداز باری صاحب کی تحریروں میں موجود ہے۔ آج کل میں جو کچھ بھی ہوں۔ اس کو بتانے میں صبر سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ اگر امرتسر میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے اُن کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا۔

چونکہ اب میں کسی حد تک ادب سے روشناس ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے اختر شیرانی کے کلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کی شاعری بگلی پھلکی اور دعائی تھی۔ میں اب فوراً کرتا ہوں تو اختر شیرانی مجھے کالج کے لوگوں کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ ایک خاص عمر کے نوجوانوں کا شاعر، جن کے دل و دماغ

پر ہر وقت روانہ کی کڑی مہین مہین جالے تھی رہتی ہے، مجھے اس وادی میں قدم رکھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک دوست سے معلوم ہوا، اختر شیرانی آئے ہوئے ہیں اور شیراز ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ اسی وقت وہاں پہنچا مگر معلوم ہوا کہ وہ مجھے کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ دیر تک ہوٹل میں بیٹھا انتظار کرتا رہا، مگر یہ لوگ واپس نہ آئے۔

شام کو پہنچا تو ہوٹل کے مندرجی باورچی نے کہا کہ سب اوپر کوٹھے پر بیٹھے ہیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں اوپر گیا۔ چڑھ کا ذکر کے چار پائیاں بکھائی گئی تھیں۔ کچے کرسیاں بھی تھیں۔ ویسی شراب کا دور چل رہا تھا۔ دس بارہ آدمی بیٹھے تھے جو میرے جانے پہچانے تھے۔ صرف ایک صورت اجنبی تھی اور وہ اختر شیرانی کی تھی چہچہا چہرہ، سپاٹ پیشانی، موٹی ناک، موٹے ہونٹ، گہرا سانولا رنگ چھدرے بال، آنکھیں بڑی بڑی اور پرکشش، ان میں تھوڑی سی اداسی بھی تھی۔ بڑی شستہ و رفتہ اردو میں حاضرین سے گفتگو کر رہے تھے۔

میں پاس پہنچا تو باتے نے ان سے میرا تعارف کرایا، بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے، اور مجھ سے بیٹھے کے لئے کہا میں چار پائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اختر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے: عزیز زمیری طرف اشارہ کر کے ان کے لئے گلاس شگراؤں۔

گلاس آیا تو اختر صاحب نے مجھے ایک پیگ بنا کر دیا جو میں نے مشکریے

کے ساتھ قبول کیا۔ دو تین دور ہوئے تو کسی نے اختر صاحب سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی اس پر انہوں نے کہا: "نہیں بھائی میں کچھ نہیں سناؤں گا۔ میں سنوں گا۔" پھر جیسے مخاطب ہوئے: "عزیز، سناؤ"۔ سیلی انکسٹروں سے نیند برساتے ہوئے آئے یہ کہا اور ایک ٹھنڈا سانس دیا۔ جیسے جیتے ہوئے ملامت یاد آگئے ہیں۔ جیسے کراہکار نہیں تھی۔ گلاماف کیا اور اختر صاحب کی ایک مشہور غزل کا ماحرور کر دی۔ سوال سب ٹھیک۔ مگر آواز پٹی پٹی سی تھی۔ پھر بھی رنگ جم گیا۔ اختر صاحب پتے سے اور جھوٹے سے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت میں شیراز ہوٹل میں میٹھا اختر صاحب کا انتظار کر رہا تھا وہ کسی دعوت پر گئے تھے کہ ایک برقعہ پوش خاتون مانگے میں انہیں آپ نے ایک دم سے اختر صاحب کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا: کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں آپ اپنا نام بتا دیجئے۔ برقعہ پوش خاتون نے اپنا نام نہ بتایا اور چلی گئی۔

اختر صاحب آئے تو میں نے اس خاتون کی آمد کا ذکر کیا۔ آپ نے بڑی شاعرانہ دلچسپی سے ساری بات سنی اور مسکرا دیئے۔ یوں وہ خاتون ایک امریکن لڑکی کھانا کھانے سے پہلے شام کو جب ٹھہرے کا دور شروع ہوا۔ تو جیسے نے اس برقعہ پوش خاتون کے متعلق اختر صاحب سے پوچھا: "حضرت وہ کون تھیں جو آج دوپہر کو تشریف لائی تھیں۔"

اختر صاحب مسکرائے اور جواب گول کر گئے۔ بالے نے ان سے کہا: کہیں  
سلفی صاحبہ تو نہیں تھیں؟

اختر صاحبہ نے ہولے سے ہاتھ کے گال پر ٹانچہ مارا اور صرف اتنا کہا  
شریہ — بات اور بھی زیادہ پراسرار ہو گئی۔ جو آج تک صیغہ ناز میں ہے معلوم  
نہیں وہ برقعہ پوش خاتون کون تھیں۔ اس زمانے میں صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ اختر  
صاحبہ کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر شیرازہ ہوٹل آئی تھیں اور اختر صاحب  
کے بارے میں اس نے پوچھا کہ کہاں ہیں۔

سب باری باری اختر صاحبہ کی دعوت کو بچے غنے۔ وہیں شیرازہ ہوٹل  
میں۔ دعوت دینے کا یہ طریقہ تھا کہ دن اور رات میں ٹرے کی جتنی بوتلیں ختم ہوں۔  
ان کے دام ادا کر دیئے جائیں۔ میں نے یہ طریقہ بھونڈا سمجھا اور دو بوتلیں اسکا  
دسکی کی لے کر ایک شام وہاں پہنچا۔ ایک بوتل پر سے کاغذ ہٹایا۔ تو  
اختر صاحبہ نے کہا: بھائی! یہ تم نے کیا کیا۔ ویسی شراب ٹھیک رہتی۔ ایک  
کے بدلے دو آجائیں؟

میں نے عرض کی: اختر صاحبہ! یہ ختم ہو جائے تو دوسری موجود ہے؟  
اختر صاحبہ مسکرائے: وہ ختم ہو گئی تو؟  
میں نے کہا: اور آجائے گی؟

آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ زندہ رہو؟

دونوں بڑھاپے ختم ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اختر صاحب اسکاچ سے  
 مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ ملازم سے امر ترسڑ شری کے کشید کردہ مختصرے کی  
 ایک بوقلمون منگوائی۔ اس نے اختر صاحب کے نشے میں جو خالی جگہیں تھیں پر کر دیں۔

چونکہ یہ محفلیں خالص الہی نہیں تھیں اور ان کے پیچھے صرف وہ عقیدت  
 تھی جو ان لوگوں کو اختر صاحب سے تھی۔ اس لیے زیادہ تر ان ہی کا کلام پڑھا  
 یا گایا جاتا۔ شرو سن کے متعلق کوئی بصیرت افروز بات نہ ہوتی، لیکن اختر صاحب کی گفتگوؤں  
 سے میں نے اعجاز نگاہ کا کہہ سکا کہ اُردو شاعری پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔

چند روز کے بعد میں نے گھر پر اختر صاحب کی دعوت کی۔ مگر یہ صرف چار  
 کی تھی جس سے اختر صاحب جیسے زندہ بانوش کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن انہوں  
 نے قبول کی اور میری خاطر ایک پیالی چائے بھی پی۔

ان محفلوں میں باری صاحب بہت کم شریک ہوئے۔ البتہ چشتی صاحب  
 جو پینے کے معاملے میں اختر صاحب سے بھی چند پیگ آگے ہی تھے۔ اکثر ان محفلوں  
 میں شریک ہوتے اور اپنا کلام بھی سناتے جو عام طور پر بچے روح ہوتا تھا۔

اختر صاحب غالباً دس دن امر ترسڑ میں رہے۔ اس دوران میں جیسے بکے بہم  
 اصرار پر آپ نے شیراز ہوٹل پر ایک نظم کہی، جیسے نے اسے باری صاحب کی دست  
 سے لے کر قند پر خوشخط لکھوایا اور قریم میں جڑوا کر اپنے ہوٹل کی زینت بنایا۔ وہ  
 بہت خوش تھا۔ کیونکہ نظم میں اُس کا نام موجود تھا۔

اختر صاحب چلے گئے ترجمے کے ہومل کی رونق غائب ہو گئی۔ باری صاحب نے اب میرے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ میرا شراب پینا ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خشک دماغ نہیں تھے۔ اشاروں ہی اشاروں میں کئی دفعہ مجھے اس قلت سے باز رہنے کے لئے کہا، مگر میں باز نہ آیا۔

باری صاحب تین چھینے امرتسر میں رہے۔ اس دوران میں انہوں نے مجھ سے دو کتب ہو کر کی ایک کتاب "مرکز نش" میرے نام سے ترجمہ کرائی، جب وہ چھپ کر برس سے باہر آئی، تو آپ لاہور میں تھے۔ میں نے جین ٹیڈ کتاب دیکھی، تو اکا باٹ پیدا ہوئی کہ اور ترجمہ کروں۔ چنانچہ میں نے "آسکر وائلڈ" کے اسٹریٹ کی ڈرامے "ویلا" کا ترجمہ شروع کر دیا، جب ختم ہوا تو باری صاحب کو اصلاح کے لئے دیا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ میسرے تحریروں میں بہت ہی کم کانٹ بھانٹ کرتے تھے، زبان کی کئی غلطیاں رہ جاتی تھیں۔ جب کوئی ان کی طرف اشارہ کرتا تو مجھے بہت بے گرفت ہوتی چنانچہ میں نے سوچا کہ باری صاحب کے بعد اختر صاحب کو ترجمے کا مسودہ دکھاؤں گا۔

عرب ہومل میں آنے جانے سے مظفر حسین شمیم صاحب سے اچھے خاصے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے اصلاح کی بات کی تو وہ مجھے اسی وقت اختر شیرانی صاحب کے پاس لے گئے چوٹا سا غلیظ کمرو تھا۔ آپ چارپائی پر تکیہ بیٹنے کے ساتھ دبائے بیٹھے تھے، جیک سیک ہوئی، اختر صاحب بٹھے

گھنے فرشتے

پہچان گئے۔۔۔ یاہان شیراز ہوٹل کے بارے میں پوچھا جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے ان کو بتا دیا۔

شیم صاحب اور اختر صاحب کی گفتگو بہت پُر تشعشع اور پُر تکلف تھی حالانکہ مجھ سے کسی شخص نے کہا تھا کہ وہ دونوں کسی زمانے میں ایک جان و دو قالب تھے بہر حال شیم صاحب نے میرے آنے کا مدعا بیان کیا۔ اختر صاحب نے کہا: میں حاضر ہوں، آج رات ہی سارا ستودہ دیکھ لوں گا:

اختر صاحب نے بیسنے کے ساتھ حکایت اس سے دیباہا بٹھا تھا کہ ان کے جگر میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد میس سی اسٹی تھی۔ اس زمانے ہی میں ان کا جگر قریب قریب بلڈف ہو چکا تھا۔ میں نے ان سے رخصت لی اور شام کو حاضر ہونے کا کہہ کر شیم صاحب کے ساتھ واپس عرب ہوٹل چلا آیا۔ انہوں نے مجھ سے اشارتاً کہا کہ اگر تم اختر سے اپنا کام جلدی کرنا چاہتے ہو تو ساتھ 'وہ حیرت' لیتے جانا۔

میں جب شام کو اختر صاحب کے پاس پہنچا تو وہ چیز میرے پاس موجود تھی جو میں نے بڑے پلٹے سے پیش کی۔ بوتل ٹوڑتے ٹوڑتے باہر نکالی اور اس سے کہا: 'کیا یہاں اس کی اجازت ہے صاف کیجئے گا یہ پوچھنا ہی بڑی بد فیزی ہے'۔

اختر صاحب کی آنکھیں تھما اٹھیں، میرا خیال ہے وہ صبح کے پیاسے تھے۔ مسکرائے اور میرے سر پر بڑی شفقت سے اٹھ پھیرا: 'شراب پینا کوئی بد فیزی نہیں! یہ کہہ کر بوتل میرے اٹھ سے لی اور کیر فرش پر رکھ کر اس پر بوتل کا نچا جھٹ



شوہن شاد رخ کیا، تاکہ لڑک باہر نکل آئے ۔

ان دنوں پتا تھا مگر میں کہنے کو زیادہ پتی نہیں سکتا تھا۔ چار پگیب کافی تھے مقدامس سے اگر بڑھ جاتی۔ تو طبیعت خراب ہو جاتی اور سارا لطف غارت ہو جاتا۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور پینے کافی دیر ہو گئی۔ اختر صاحب کا کھانا آیا اور جس طریقے سے آیا اس سے میں نے یہ جانا کہ ان کے گھر والوں کے تعلقات ان سے کشیدہ ہیں۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ان کے والد مکرّم جانا محمود شیرانی صاحب (مرحوم و مضمر) ان کی شراب نوشی کے باعث بہت نالاں تھے۔ تنہا بار کر انہوں نے اختر صاحب کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

رات زیادہ گزر گئی تو میں نے اختر صاحب سے درخواست کی کہ وہ مسودہ دیکھنا شروع کر دیں۔ آپ نے یہ درخواست قبول کی اور مسودے کی اصلاح شروع کر دی۔ چند صفحات دیکھے تو اسکو والٹ کی رنگین زندگی کی باتیں شروع کر دیں جو غالباً انہوں نے کسی اور سے سنی تھیں۔ اسکو والٹ اور لارڈ ایفرڈ انگلس کے معاشرے کا ذکر آپ نے بڑے مزے لے لے کر بیان کیا۔ والٹ کیسے قید ہوا یہ بھی بتایا پھر ان کا ذہن ایک دم لارڈ بائرن کی طرف چلا گیا۔ اس شاعر کی ادا انہیں پسند تھی اس کے معاشرے جو کہ لاتعداد تھے اختر صاحب کی نگاہوں میں ایک جلا گندہ شان رکھتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ لارڈ بائرن کے نام سے انہوں نے کئی غزلیں

اور نظمیں بھی کہی تھیں ۔

لارڈ بائرن ایک سنگدل بے رحم اور بے پروا انسان تھا ۔ اس کے علاوہ وہ ایک ہیٹ بڑا فوٹاب تھا جس کے پاس دولت تھی ۔ اختر صاحب تلاش تھے بڑے رحم دل اور انسانیت دوست ۔ بائرن کو بڑھیا سے بڑھیا شراب میسر تھی اختر کو بشکل خطر تھا ۔ بائرن کے ملک کی فضا ابد تھی اختر کے ملک کی فضا اور وہ کسی صورت میں بھی لارڈ بائرن نہیں بن سکتے تھے ۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے دل کی تسکین کیلئے وہ مشوق اختر کا کرپے تھے ۔ سلمیٰ اور عذرا ۔

سلمیٰ کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ سلمیٰ حقیقتاً کوئی سلمیٰ تھی ، ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر جو سلمیٰ ہیں اختر کے کلام میں نظر آتی ہے یکسر تخیلی ہے ۔ اس کا رومد اس قدر شفاف ہے کہ صاف ایتقری معلوم ہوتا ہے ایک اور بات بھی ہے ۔ اگر سلمیٰ کوئی گوشت پرست کی زندہ عورت ہوتی تو شاید اس سے اتنی وابہاد محبت کبھی دکرتا ۔ مگر چونکہ وہ اس کی اپنی تخلیق تھی ۔ اس لئے وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا ۔

لارڈ بائرن کی باتیں سنتے سنتے مجھے نیند آگئی اور وہیں سو گیا صبح اٹھا ، تو دیکھا ۔ اختر صاحب فرش پر بیٹھے مسودہ دیکھنے میں مصروف ہیں ۔ بوتل میں تھوڑی سی پکی ہوئی بٹر اب تھی ۔ یہ آپ نے پی اور آخری صفحات دیکھ کر مسودہ میرے حوالے کیا اور کہا ۔ ترجمہ بہت اچھا ہے کہیں کہیں زبان کی غلطیاں تھیں ۔ وہ میں نے درست

کر دی ہیں :

میں سے مناسب و موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا اور امرتسر روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد میں جب کبھی لاہور جاتا، اختر صاحب کے نیاز ضرور حاصل کرتا، ایک بار گیا تو دیکھا کہ آپ کے سرور چٹیاں بندھی بندھی ہیں، ان سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا، ”مجھے تو قلنا یاد نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کل رات میں نے مانگے میں سوار ہونے کی کوشش کی مگر گر پڑا اور چٹیں اس وجہ سے آئیں“۔

اختر صاحب کی اپنی ذات کے بارے میں یہ صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔

بعض اوقات وہ بالکل بچہ بن جاتے تھے، ان کی گفتگو اور حرکات بالکل بچوں کی سی ہوتیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بچہ بن کر وہ بچکانہ قسم ہی کی مسرت عکس کر دیتے تھے، کچھ عرصے کے بعد میں بمبئی چلا گیا، اختر صاحب سے اتنے ہراسم نہیں تھے کہ

خط و کتابت ہوتی، لیکن جب انہوں نے رسالہ ”روان“ جاری کیا تو میں نے انہیں مبارک باد کا خط لکھا، اب میں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا، ترجمے کا دور وہیں لاہور اور امرتسر میں ختم ہو گیا تھا، میں نے بیچ فراڈ افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے، جو مقبول ہوئے تھے ”روان“ میں احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ

مجھے بہت پسند آیا، بمبئی کے ہفتہ وار ”مصور“ میں ”روان“ پر تبصرہ کرنے مجھے میں نے اس کی تعریف کی، اختر صاحب کو علیحدہ خط لکھا تو اس میں بھی افسانے کو بہت سراہا، چند دنوں کے بعد احمد ندیم قاسمی کا محبت بھرا خط موصول ہوا جو

ایک طویل سلسلہ خط و کتابت کا پیش خیر تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ”رومان“ بند ہو گیا اور اختر میری نظروں سے مکمل طور پر دھجھل ہو گئے۔ کئی برس گزر گئے۔ ملک کی سیاست نے کئی رنگ بدھے تھے کہ بخوارہ اُن پہنچا۔ اس سے پہلے جو بڑھ چھا اس سے آپ سب واقف ہیں۔ اس دوران میں اخباروں میں خبر چھی کر اختر صاحب کو ملک سے پاکستان آ رہے تھے کہ راستے میں بلوائیوں نے ان کو شہید کر دیا۔ بہت افسوس ہوا۔ میں، بصمت اور شاہد لطیف دیر تک ان کی باتیں کرتے اور افسوس کرتے رہے۔

کئی اخباروں میں ان کی موت پر مضامین شائع ہوئے۔ اُن کی بہرائی نظمیں چھپیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کی موت کی خبر کی تردید ہو گئی معلوم ہوا کہ وہ بیخبر دعائیت لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اس سے بمبئی کے ادبی حلقے کو بہت خوشی ہوئی۔

تقسیم کے پانچ بیٹے بعد میں بمبئی چھوڑ کر لاہور چلا آیا کیوں کہ سب عزیز و اقارب یہیں جمع تھے۔ قراط و تفریط کا عالم تھا۔ اختر صاحب سے ملنے کا خیال ملک دماغ میں نہ آیا۔ بڑی مدت کے بعد یوم اقبال کے جلسے میں ان کو دیکھا مگر نہایت ہی ابتر حالت میں۔

رات کے جلسے کی صدارت اختر صاحب کو کرنا تھی۔ یونیورسٹی ہال میں حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔ جلسے میں شرکت کے لئے سجادت سے علی سردا جلالی

اور کیفی افسوس آئے ہوئے تھے۔ وقت ہو چکا تھا مگر صاحب صدر موجود نہیں تھے میں نے ساحر اصرار نیوی سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ اختر شیرانی صاحب ڈال کے باہر پیسے ہیں۔ ان کی حالت بہت خیر ہے۔ اس لئے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ وہ صدارت دہریں مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ ٹھہرے ہیں۔

میں باہر گیا تو دیکھا وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہیں اور پیسے ہیں۔  
ظہیر کشمیری کے اصرار میں بتل ہے۔ آپ نے گلاس ختم کیا اور ظہیر سے کہا: ”چلو اجلاس کا وقت ہو گیا۔“ ظہیر نے ان کو روک دیا۔ ”جی نہیں۔ ابھی کہاں ہوا ہے۔“ مگر اندر ڈال سے نظم پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ آپ نے ٹوکڑاٹے ہوئے الف ظ کے اپنے منہ میں کئی کئی ٹوکڑے کھاتے ہوئے کہا: ”جلد شروع ہو چکا ہے۔ مجھے آواز آ رہی ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ظہیر کو دھکا دیا۔ اس وقت پر میں آگے بڑھا اختر صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بائیں دھچپا مارنے سے ان کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے ان کو جھنجھوڑا اور اپنا نام بتایا۔ اس پر انہوں نے ایک ایسی ”آہ“ کی اور مجھے لگے لگا یا اور سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ الفاظ چونکہ ان کے منہ میں اوپر تلے ہو کر ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ اس لئے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ ظہیر نے میرے کان میں کہا کہ میں انہیں اندر ڈال میں نہ جانے دوں۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ اختر صاحب سے یہ کہا: ”اتنی دیر کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ کیا اس کی خوشی میں بوتل میں سے مجھے کچھ منٹے گا۔“

آپ نے ظہیر کا شیریں سے کچھ کہا۔ جس کا غائبانہ مطلب تھا کہ سعادت کو ایک گلاس نہا کر دو۔ ظہیر گلاس میں آتش بیاں اٹھانے لگا کہ اختر صاحب بنری سے لڑکھڑاتے ہوئے ہال کے اندر داخل ہو گئے اور ہیں اس کی اس وقت خبر ہوئی جیب ان کو رہا نہیں جاسکتا تھا۔ پھر بھی میں دوڑ کر اندر گیا اور چوتھے پرچہ سے پہلے ان کو روک لیا۔ مگر وہ میری گرفت سے نکل کر کڑی صداوت پر جا بیٹھے جیسے کہ تسلیں بہت پریشان ہوئے۔ کیا کریں کیا نہ کریں سب اسی غصے میں گرفتار تھے ان کی حالت بہت بُری تھی۔ کچھ دیر تو وہ خاموش بیٹھے کسی پر جھولتے رہے۔ لیکن جب آپ نے انھیں اٹھا کر نقرہ کرنا چاہی تو معاملہ بڑا لگیں ہو گیا۔ ان کو دفن کے ساتھ آپ بل مار اپنی ڈھیلی تلون ٹھیک کرنے اور ثابت قدم رہنے کی ناکام کوشش میں بار بار لڑکھڑاتے تھے آپ کی گنت زدہ زبان سے خدا معلوم کیا نکل رہا تھا۔

حاضریں میں سے کسی شخص نے جلد آواز میں کہا "یہ شرابی ہے۔ اسے باہر کاٹو۔" بس طمان برپا ہو گیا۔ ایک نے پنوں پر کھڑے ہو کر بڑے خفے میں کہا "یہ پاکستان میں کیا ہی کچھ ہو گا۔" دوسرا چلایا۔ اور جیسے میں خواتین بھی موجود ہیں۔

اختر صاحب براہِ برستے رہے۔ ایک تو ویسے ہی ان کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ غور میں تو وہ شور کا ایک مہربانی تھی۔ جب معاملہ بڑھ گیا تو دوست احباب اختر صاحب کو زبردستی ہال سے باہر لے گئے۔ غصہ بہت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن غوریش کا شیریں کی بروقت تقویٰ نے مدد کی اور ہال پر سکون ہو گیا۔

اس کے بعد اختر صاحب سے آخری ملاقات یوہسپتال میں ہوئی۔  
 میں پریوینر پروڈکشنز ٹیڈ کے لئے ایک فلمی کہانی لکھنے میں مصروف تھا کہ  
 احمد ندیم قاسمی آئے۔ آپ نے بتایا: "میں نے کسی سے سُننے کے لئے اختر صاحب کو  
 تین روز سے خطرناک طور پر علیل ہیں۔ اور یوہسپتال میں پڑے ہیں۔ جبری کسیمرسی  
 کی حالت میں کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟"

ہم سب نے آپس میں مشورہ کیا۔ مسعود پروین نے ایک راہ نکالی جو یہ تھی  
 کہ ان کی دو تین غزلیں یا نظمیں نظم کے لئے لی جائیں اور پروین پروڈکشنز کی  
 طرف سے پانچ سو روپے بطور معاوضے کے ان کو دے دیئے جائیں۔ بات  
 مقبول تھی چنانچہ ہم اسی وقت موٹر میں بیٹھ کر یوہسپتال پہنچے۔

۱۔ مریضوں سے ملنے کے لئے ہسپتال میں خاص اوقات مقرر ہیں اس لئے  
 ہمیں وارڈ میں جانے کی اجازت نہ ملی۔ ڈیوٹی پر اس وقت بروڈاکٹر مقرر تھے۔ ان  
 سے ملے جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہم اختر شیرانی سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ نے  
 بڑے خطرناک لہجے میں کہا: "ان سے ملاقات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے پوچھا: "کیوں؟"

ڈاکٹر صاحب نے اس لہجے میں جواب دیا: "وہ بیہوش ہیں۔ جب سے یہاں  
 آئے ہیں، ان پر غشی طاری ہے۔ یعنی انکو کب کو مات

یہ سن کر ہمیں اختر صاحب کو دیکھنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہوا۔ ہم نے

اس کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اُسٹے اور اسیں وہاں لے گئے جہاں ہمارا رومانی شاعر، سلمیٰ اور عذرا کا خالق ہے ہوش بڑھتا۔ بیڈ کے ارد گرد کپڑا اتارتا۔ ہم نے دیکھا اختر صاحب انگلیں بند کئے پڑے ہیں۔ لمبے لمبے تابووار سانس لے رہے ہیں۔ ہونٹ آواز کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ ہم تینوں ان کو اس حالت میں دیکھ کر ہر مردہ ہو گئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: ہم امکان ہجر کوشش کر چکے ہیں۔

استریاں بھی جواب دے چکی ہیں۔ ایک صرف دل ابھی

حالت میں ہے۔ گھپ اندھیر سے بس امید کی بس یہی ایک چوٹی سی کرن ہے؟

جب ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اختر صاحب کے اس وقت

میں کسی دکھی طرح کام آنا چاہتے ہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا:

”اچھا تو میں آپ کو ایک دوا کا نام بتاتا ہوں۔ آپ اسے حاصل

کرنے کی کوشش کیجئے۔ یہاں پاکستان میں تو بالکل نایاب ہے

فلک سے بھارت میں مل جائے۔“

ڈاکٹر صاحب سے دوا کا نام بکھوا کر میں فیض صاحب کے

پاس پہنچا۔ اور ان کو ساری بات بتائی۔ آپ نے اُسی وقت امرتسر

ٹیلی فون کرایا۔ اور اپنے اخبار کے ایڈیٹر سے کہا کہ وہ دوا



اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں

حاصل کر کے فوراً لاہور بھجوا دے۔ لیکن انفرس دوا نہ ملی۔  
مسودہ پرویز نے دلی قون کیا۔ وہاں سے ابھی جواب نہیں آیا تھا  
کہ اختر صاحب بے ہوشی کے عالم میں اپنی سسلی اور عذرا کو  
پیدر سے ہو گئے۔

بہادر عمر ملاقات دوستداران است  
جہ خط برد غفر از عمر جاوداں تنہا

اختر شیرانی

۱۸/۴/۲۲

حسن بڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے۔ یہ میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور میرا جی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس شخص کو پہلی بار میں نے یہیں دیکھا تھا۔ اس کا نام چالیس تھا۔ بلجے چھوڑ کر مجھے دہلی آئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مجھے یاد نہیں کہ وہ فلیٹ نمبر ایک والوں کا دوست تھا یا ایسے ہی چلا آیا تھا۔ لیکن مجھے آنا یاد ہے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ اس کو ریڈویشن سے پنا چلا کہ میں بحسن بڈنگز پر مسادت حسن بڈنگز میں رہتا ہوں۔

اس ملاقات سے قبل میرے اور اس کے درمیان معمولی سی خط و کتابت ہو چکی تھی۔ میں بھی میں تھا جب اس نے اہل دنیا کے لئے تجھ سے ایک افسانہ طلب کیا تھا۔ میں نے اس کی غرابش کے مطابق افسانہ بھیج دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا

کہ اس کا سادہ منہ مجھے ضرور منا چاہیئے۔ اس کے جواب میں اس نے ایک خط لکھا کہ میں استاد واپس بھیج رہا ہوں۔ اس لئے کہ ”ادبی دنیا“ کے مالک محنت خور قسم کے آدمی ہیں۔ افسانے کا نام ”موسم کی شرارت“ تھا۔ اس پر اچھی نے اعتراض کیا تھا۔ کہ اس شرارت کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے اسے تبدیل کر دیا جائے میں نے اس کے جواب میں اس کو لکھا کہ موسم کی شرارت ہی اس افسانے کا موضوع ہے مجھے حیرت ہے کہ یہ تمہیں کیوں نظر نہ آئی۔ میرا جی کا دوسرا خط آیا، جس میں اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اور اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ موسم کی شرارت وہ ”موسم کی شرارت“ میں کیوں دیکھ نہ سکا۔

میرا جی کی لکھائی بہت صاف اور واضح تھی، مرنے کے خط کے نب سے نکلے ہوئے جیسے صحیح نشست کے حروف ہر کون کی سی آسانی سے بنے ہوئے ہر چڑھائیاں ہیں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے اس میں مرنے والا حامد علی ظہن مدیر جابوں کی خطاطی کی جھلک نظر آئی۔ یہ بھی سی گر کا کافی مرنے کا مثلت و مشابہت اپنے ائمہ کیا گہرائی رکھتی ہے۔ اس کے متعلق میں اب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا کوئی شرش یا نقطہ سچائی نہیں دیتا، جس پر میں کسی مفروضے کی بنیادیں کھڑی کر سکوں۔ حسن بڑے گز کے فیلڈ نمبر ایک میں ہمیں گڑے میرے سامنے میز پر پڑے تھے اور میرا جی لم ترنگے اور گرل مشرل شعر کہنے والا شاعر مجھ سے بڑے صحیح قد و قامت اور بڑی صحیح نوکد ہلک کی باتیں کر رہا تھا۔ جو میرے افسانوں کے متعلق تھیں وہ

## مجھے فرستے

قریب کر رہا تھا۔ تفتیش۔ ایک مختصر سا تبصرہ تھا۔ ایک سرسری سی تنقید تھی۔ مگر اس سے پتا چلتا تھا۔ کہ میراجی کے دماغ میں کٹری کے جانے نہیں۔ اس کی باتوں میں الجھاؤ نہیں تھا۔ اور یہ چیز میرے لئے باعث حیرت تھی۔ اس لئے کہ اس کی اکثر نظمیں ابہم اور الجھاؤ کی وجہ سے ہمیشہ میری فہم سے بالاتر رہی تھیں۔ لیکن شکل و صورت اور وضاحت قطع کے اعتبار سے وہ باطل ایسا ہی تھا۔ جیسا اس کا بے قافیہ مبہم کلام۔ اس کو دیکھ کر اس کی شاعری میرے لئے اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔

ن۔ م۔ راشد بے قافیہ شاعری کا امام مانا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے کا اتفاق بھی دہلی ہی میں ہوا تھا۔ اس کا کلام میری سمجھ میں آ جاتا تھا۔ اور اس کو ایک نثر دیکھنے سے اس کی شکل و صورت بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ چنانچہ ایک بار میں نے ریڈیو اسٹیشن کے برآمدے میں پڑی ہوئی فیئرڈاگرڈوں کی سائیکل دیکھ کر اس سے اصرام مذاق کہا تھا۔ نو۔ یہ تم ہو اور تمہاری شاعری؟ لیکن میراجی کو دیکھ کر میرے ذہن میں سوائے اس کی مبہم نظموں کے اور کوئی شکل نہیں بنتی تھی۔

میرے سامنے میز پر تین گولے پڑے تھے۔ تین آہنی گولے۔ سگرٹ کی پیڑوں میں پھٹے ہوئے۔ دو بڑے ایک چھوٹا۔ میں نے میراجی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور اس کے اوپر اس کا بڑا بھروسہ بالوں سے اٹا ہوا سر۔۔۔ یہ بھی تین گولے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے۔ ایک بڑا۔ میں نے یہ ثالث عروس کی توس کا رد عمل میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ میں نمودار ہوا۔ میراجی دھڑکنے والے تار تارے

میں بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے قرآن اپنی شروع کی ہوئی بات اور صوری چوڑ کر مجھ سے پوچھا: کیوں بیٹا، کس بات پر سکرانے؟

میں نے میرے ہرٹسے ہونے ان تین گولوں کی طرف اشارہ کیا۔ اب میرا تھی کی بادی تھی اس کے پتلے پتلے ہونٹ بہین بہین صوری مونچروں کے نیچے گول گول انداز میں سکرانے۔

اس کے گلے میں مرنے مرنے گول شکلوں کی مالا تھی جس کا صرف بالائی حصہ قیض کے کھلے ہوئے کا لہر سے نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا: اس انسان نے اپنی کیا ہیئت کنڈائی بنا رکھی ہے۔ بے بے غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹکتے تھے۔ فریج کٹ سی دھڑ سی ہیں سے بھرے ہوئے ناخن ہر دیوں کے دن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مینوں سے اس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاعر ادیب اور ایڈیٹر عام طور پر لائڈری میں ننگے میڈ کر ڈبل ریٹ پر اپنے کپڑے دھلایا کرتے تھے اور بڑی سیلی کیلی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے سوچا شاید میرا تھی بھی اسی قسم کا شاعر اور ایڈیٹر ہے۔ یہ کہ اس کی غلاقت اس کے بے بال اس کی فریج کٹ دھڑ سی گلے کی مالا اور وہ تین آہنی گولے۔ معاشی حالات کے منظر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان میں ایک درویشانہ پن تھا۔ ایک قسم کی راہبیت..... جب میں نے راہبیت کے تعلق سے سوچا تو میرا داغ دھس کے دیوانے راہب لاسپوٹین کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہاں

پڑھا تھا کہ وہ بہت غلاظت پسند تھا۔ بلکہ میں کہنا چاہیے کہ غلاظت کا اس کو کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اس کے ناخنوں میں بھی ہر وقت میل بھرا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس کی انگلیاں تھڑی ہوتی تھیں۔ جب اُسے ان کی صفائی مطلوب ہوتی تو وہ پاس بیٹھی شہزادیوں اور رئیس نادیوں کی طرف بٹھا دیتا۔ جو ان کی تمام آلودگی اپنی زبان سے چاٹ لیتی تھیں۔

کیا میرا جی اسی قسم کا دردیش اور مایوس تھا —؟ یہ سوال اس وقت اور بعد میں بھی کئی بار میرے دماغ میں پیدا ہوا۔ میں امرتسر میں سائیں گھوڑے شاہ کو دیکھ چکا تھا۔ جو اعلیٰ نگاہ رکھتا تھا۔ اور کبھی نہ لانا نہیں تھا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی سائیں اور دردیش میری نظر سے گزر چکے تھے جو غلاظت کے پتلے تھے۔ مگر ان سے مجھے گھٹن آتی تھی۔ میرا جی کی غلاظت سے مجھے نفرت کہیں نہیں ہوئی۔ المجن البتہ بہت ہوتی تھی۔

گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیں عام طور پر بعد از تفریق منسلقات کہتے ہیں۔ مگر میرا جی کے منہ میں سے میں نے کبھی کوئی غلیظ کلمہ نہ سنا۔ اس قسم کے سائیں بظاہر ہر عذر و درود ہر قسم کے جنسی فعل کے ترکیب ہستے ہیں۔ میرا جی بھی عجز و عجز تھا۔ مگر اس نے اپنی جنسی تسکین کے لئے صرف اپنے دل و دماغ کو اپنا شریک کار بنایا تھا۔ اس لحاظ سے گرائس میں اور گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیں میں ایک گہرے مماثلت تھی۔ مگر وہ ان سے بہت مختلف تھا۔ وہ تین گرے تھا۔ . . . جن کو دھکانے کے لئے

اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس تھک کی فزاسی حرکت اور تخیل کی  
 لگی سی جنبش سے وہ ان تین اجسام کو انہی سے اپنی ملکہ اور پچی گہرائی کی سیر  
 کر سکتا تھا اور یہ گڑ اس کو انہی تین گویوں نے بتایا تھا جو غالباً اس کو کہیں پڑے ہو  
 طے تھے۔ ان خارجی اشاروں ہی نے اس پر ایک ازلی راہ ہی حقیقت کو منکشف  
 کیا تھا جن حقائق اور موت..... اس تثلیث کے تمام اقلیدسی زاویے صرف  
 ان تین گویوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے۔ لیکن حق اور مشق کے انجام کو  
 چونکہ اس نے شکست خوردہ میننگ سے دیکھا تھا۔ جس کے شبیہوں میں بال پڑے  
 تھے اس لئے اس کو سب شکل میں اس نے دیکھا تھا۔ صحیح نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس  
 کے مددے وجود میں ایک ناقابل بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا۔ جو ایک نقطے سے شروع  
 ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ ہر نقطہ اس کا نقطہ آغا ہے  
 اور وہی نقطہ انجام بھی وجہ ہے کہ اس کا ابہام نہ کیلا نہیں تھا۔ اس کا رُخ سمت کی  
 طرف تھا نہ زندگی کی طرف، اربعائیت کی سمت، نہ قنوطیت کی جانب اس نے آغاز  
 اور انجام کو اپنی مٹھی میں اس زور سے بچھ رکھا تھا۔ کہ ان دونوں کا بہرہ نچر پڑو کہ  
 اس میں سے ٹکٹا رہتا تھا۔ لیکن سادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسوہ نظر  
 نہیں آتا تھا۔ یہاں پھر اس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ ان تین گویوں کی طرح  
 جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بلڈنگز کے ٹیٹ قبر ایک میں دیکھا تھا۔  
 اس کے شعر کا ایک مصرع ہے۔

مگرے مگرے پیرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

مسافر کو رستہ بھولنا ہی تھا۔ اس نے کہ اس نے چلتے وقت نقطہ آستانہ پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ اپنے بنائے ہوئے دائرے کے خط کے ساتھ ساتھ حکومت وہ یقیناً کئی بار ادھر سے گزرا۔ مگر اسے یاد نہ رہا کہ اس نے اپنا یہ طویل سفر کہاں سے شروع کیا تھا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میرا جی یہ بھول گیا تھا کہ وہ مسافر ہے سفر ہے یا راستہ۔ یہ تشلیٹ ہیں اس کے دل و دماغ کے غلیوں میں دائرے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

اس نے ایک روکی میرا سے محبت کی۔ اور وہ شاد و اشد سے میرا جی بن گیا۔ اسی میرا کے نام کی رعایت سے اُس نے میرا پاؤں کے کلام کو پسند کرنا شروع کر دیا جب اپنی اس محبوبہ کا جسم میرا آیا۔ تو کوزہ گھر کی طرح چاک گھما کر اپنے تخیل کی مٹی سے شروع شروع میں اُسی شکل و صورت کے سیم تیار کرنے شروع کر دیئے لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس جسم کی ساخت کے تمام عزائت، اس کی تمام نمایاں خصوصیات تیز رفتار چاک پر گھوم گھوم کر خفیہ حیثیت اختیار کرنی لگیں۔ اور ایک وقت ایسا آیا۔ کہ میرا جی کے ہاتھ اس کے تخیل کی نرم نرم مٹی اور چاک، متواتر گردش سے بالکل گول ہو گئے۔ کوئی بھی ناگ میرا کی ناگ ہو سکتی تھی کوئی بھی چیترا میرا کا پیرا بن بن سکتا تھا۔ بد گھنڈ میرا کی دگھنڈ میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اور اتہا بہ ہوئی کہ تخیل کی نرم نرم مٹی کی سونہی سونہی باس مٹا دی گئی اور وہ شکل دینے سے پہلے



ہی اس کو چاک سے آمارنے لگا۔

پہلے میرا بلند بام حلوں میں رہتی تھی۔ میرا جی ایسا بٹکا کر مانتا بٹول کر اس نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اس کو اس گراؤٹ کا مطلقاً احساس نہ تھا۔ اس نے گراؤٹائی میں ہر قدم پر تیرا کا تھیل اس کے ساتھ تھا۔ جو اس کے جوتے کے طوروں کی طرح گھستا گیا۔ پہلے میرا عام مہرباؤں کی طرح ڈھبی غریبوت تھی۔ لیکن یہ غریبوت تھی ہر سوانی پرشاک میں بلوس دیکھ دیکھ کر کچھ اس طور پر اس کے دل و دماغ میں مسخ ہو گئی تھی۔ کہ اس کے صبح و شام کی اناک بدائی کا بھی میرا جی کو احساس نہ تھا۔ اگر احساس ہوتا تو اتنے بڑے ایسے کے جلوس کے چند غیر مبہم نشانات اس کے کلام میں یقیناً موجود ہوتے۔ جو میرا سے محبت کرتے ہی اس کے دل و دماغ میں ٹکنا شروع ہو گیا تھا۔

حسن و عشق اور موت۔ یہ تینوں چپک کر میرا جی کے وجود میں گول ہو گئی تھی۔ صرف یہی نہیں دنیا کی ہر شے اس کے دل و دماغ میں مدور ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ارکانِ شہادہ کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ ان کی ترتیب —

درہم بہم ہو گئی تھی۔ کبھی موت پہلے سن آخر اور عشق درمیان میں۔ کبھی عشق پہلے موت اس کے بعد اور سن آخر میں۔ اور یہ پکڑنا محسوس طور پر چلتا رہتا تھا۔

کسی بھی صورت سے عشق کیا جائے مگر ایک ہی قسم کا جتا ہے۔ حسن و عشق اور موت — عاشق و معشوق اور وصل۔ میرا سے شہداء اللہ کا وصال جیسا کہ جانے والوں

کو معلوم ہے، اہہ ہوا نہ ہو سکا۔ اس نہ ہونے یا نہ ہونے کا وہ عمل میرا ہی تھا۔ اس نے اس ماحول میں شکست کھا کر اس تثلیث کے ٹکڑوں کو اس طرح جوڑا تھا کہ ان میں ایک ساقیت تو آگئی تھی، مگر اصلیت مسخ ہو گئی تھی۔ وہ تین نوکریں جن کا رُخ خلد مستقیم میں ایک دوسرے کی طرف ہوتا ہے دب گئی تھیں۔ رسالہ عجوبہ کرنے اب یہ لازم نہیں تھا کہ محبوب موجود ہو۔ وہ خود ہی عاشق تھا خود ہی معشوق اور خود ہی رسالہ۔

مجھے معلوم نہیں اس نے کسے کہ یہ گولے کہاں سے لیے تھے۔ خود حامل کئے تھے یا کہیں پڑے ہوئے لی گئے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ ان کے تعلق میں نے بیٹی بل اس سے استفادہ کیا تھا۔ تو اس نے سرسری طور پر اتنا کہا تھا میں نے یہ خود پیدا نہیں کئے اپنے آپ پیدا ہو گئے ہیں۔

پھر اس نے اس گولے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جو سب سے بڑا تھا۔ پہلے یہ وجود میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ دوسرا جو اس سے چھوٹا ہے۔ اس کے پیچھے یہ کوچک؟

میں نے مسکرا کر اس سے کہا تھا: بڑے تو باوا آدم علیہ السلام ہوئے خدا اُن کو وہ جنت نصیب کرے جس سے وہ نکالے گئے تھے۔ دوسرے کو ہم اماں خدا کہہ لیتے ہیں اور تیسرے کو ان کی اولاد۔!

یہی اس بات پر میرا ہی خوب کھل کر ہنسا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے

## گلے فرشتے

ان تین گروں پر ساری دنیا گھومتی نظر آتی ہے۔ تخلیق کیا تخلیق کا دوسرا نام نہیں وہ تمام شلشیں جو ہماری زندگی کی تقدیریں میں سرحد ہیں۔ کیا ان میں انسان کی تخلیق قوتوں کا نشان نہیں ہے۔

خدا، بیٹا اور روح القدس، عیسائیت کے اقانیم — ترسول جہاد یوکار  
شاخہ بھالائے تین دیوتا۔ برہما، وشنو، ترلوک — آسمان زمین اور پاتال —  
خشتی، تری اور ہوا — تین بنیادی رنگ، سرخ، نیلا اور زرد پھر ہمارے  
رسوم اور مذہبی احکام، یہ تیجہ، سوئم اور تیلیٹیاں، وضو میں تین مرتبہ اتھ منہ دھونے  
کی شرط، تین طلاقیں اور سرگودہ سلفقے۔ اور جہنم میں نرد بازی کے تین پانسوں  
کے تین تھلے یعنی تین کانے۔ موسیقی کے تینے — حیات انسانی کے تینے  
کو اگر کھود کر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے، ایسی کئی تشلیشیں مل جائیں گی، اس  
لئے کہ اس کے توالد و تناسل کے افعال کا محور بھی اعضائے ثلاثہ ہے۔

اقلیدس میں مثلث بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اشکال کے  
تقابلے میں، ایسی کثرت اور بے لچ شکل ہے۔ جسے آپ کسی اور شکل میں تبدیل  
نہیں کر سکتے۔ لیکن میرا جی نے اپنے دل و دماغ اور جسم میں اس ممکن کو جس کا  
ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ کچھ اس طرح دبایا کہ اس کے رکن اپنی جگہوں سے ہٹ  
گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پاس کی دوسری چیزیں بھی اس ممکن کے ساتھ  
سج ہو گئیں اور میرا جی کی شاعری ظہور میں آئی۔

پہلی طاقت ہی میں میری اس کی جتنی کھنٹی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے دہلی میں بتایا تھا کہ اس کی جنسی اجابت عام طور پر ریڈیو سٹیشن کے اسٹوڈیوز میں ہوتی ہے۔ جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے۔ تو وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کر لیا کرتا تھا۔ اس کی یہ جنسی ضلالت ہی، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی جسم فطرت کا باعث ہے۔ وہ جیسا کہ میں پہلے پہلی کرچکا ہوں عام گفتگو میں وہ بڑا واضح واضح رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس پر چلتی ہے اشارہ میں بیان ہو جائے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ جو مصیبت اس پر ٹوٹی تھی۔ اس کو اس نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے جوڑ کر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا۔ اس کو اس کا علم تھا۔ اس ضمن میں وہ اپنی بے چارگی ابھی طرح محسوس کرتا تھا۔ لیکن عام آدمیوں کی طرح اس نے اپنی اس کمزوری کو اپنا خاص گنگ بنانے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ اس میرا کو بھی اپنی گمراہی کی منولی پر چڑھا دیا۔ بحیثیت شاعر کے اس کی حیثیت وہی ہے جو گنگے شاعر کی ہوتی ہے۔ جسے کھا دے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کا کلام بڑی عمدہ کھا د ہے۔ جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کے رہے گی۔ اس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کلام ہے۔ جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لیے اُنہی فضاؤں میں مرغ بادنا کا کام دے سکتا ہے۔ اس کا کلام ایک "چمک سا پزل" ہے جس کے ٹکڑے بڑے اطمینان اور سکون سے جوڑ کر دیکھنے چاہیئیں۔

بحیثیت انسان کے وہ بڑا دلچسپ تھا۔ پہلے دیکھنے کا فلسفہ جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب مفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ شخص جو اپنی خواہشات جہانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر اسی قسم کے غلط ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں مگر اس قریب وہی میں جو غلط ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

میراجی نے شاعری کی، بڑے غلوں کے ساتھ، شراب پی، بڑے غلوں کے ساتھ، بھنگ پی، وہ بھی بڑے غلوں کے ساتھ۔ لوگوں سے دوستی، اور اُسے بنایا۔ اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کو پھیل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکا قریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔ اس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اس قدر بے مزہ ہو گیا تھا کہ بے مصرف ماحول ہو رہا تھا۔ ایک ہلکا ہوا مسافر جی ٹی ٹی جی چھو رہا ہے۔ منتر یہی قدم قدم پر اپنی آغوش اس کے لئے داکرتی ہیں مگر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جا رہا ہے.... کسی ایسی جگہ جس کی کوئی قیمت ہے نہ رتبہ..... ایک ایسی ٹکون کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہلکے تین دائروں کی شکل میں اس کے گرد دگوم رہے ہیں۔

میں نے میراجی سے اس کے کلام کے متعلق دو تین جملوں سے زیادہ کبھی گفتگو نہیں کی تھی اسے بکواس کہا کرتا تھا۔ اور وہ اسے تسلیم کرتا تھا ان میں گویں اور موٹے موٹے دائروں کی انوکھی اس کا فراڈ کہتا تھا۔ اسے بھی وہ تسلیم کرتا تھا۔

تین گئے

حالانکہ ہم دونو جانتے تھے کہ یہ چیزیں فراڈ نہیں ہیں۔

ایک دن اس کے ہاتھ میں تین کے بھائے دو گئے دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے جب اس کا اظہار کیا تو میرا جی نے کہا: برغور دار کا انتقال ہو گیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور پیدا ہو جائے گا!

میں جب تک بمبئی میں رہا۔ یہ دوسرا برغور دار پیدا نہ ہوا۔ یہ تو ماں خواہم ہو گئی تھی یا باوا آدم مردم خیز نہیں رہے تھے۔ یہ رہی سہی خارجی خشیت بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اور یہ بُری فال تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرا جی کو اس کا احساس تھا چنانچہ جیسا کہ سننے میں آیا ہے، اُس نے اس کے باقی کے وہ اقوام بھی اپنے ہاتھ سے جیلندہ کر دیئے تھے۔

مجھے معلوم نہیں میرا جی گھومتا گھامتا کب بھی پہنچا۔ میں ان دنوں غمستان میں تھا جب وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ بہت خنہ حالت میں تھا۔ ہاتھ میں تین گولے بدستور موجود تھے۔ بوسیدہ سی کاپی بھی تھی۔ جس میں غالباً میرا بانی کا کلام اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک عجیب شکل کی توڑی تھی جس کی گردن مڑی ہوئی تھی، اس میں میرا جی نے شراب ڈال رکھی تھی۔ بوقت طلب وہ اس کا گال کھوتا اور ایک گھونٹ چڑھا لیتا تھا۔

دراصلی غائب تھی، سر کے بال بہت جگے تھے۔ مگر بہن کی غلاظت بدستور موجود چہل کا ایک پیر درست حالت میں تھا۔ دوسرا مرست طلب تھا۔ یہ کمی

اس نے پاؤں پر دسی باندھ کر دھک کر رکھی تھی۔ تھوڑی دیر اور دھک کر رکھی تھیں۔ ان دنوں غالباً آٹھ دن کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اس کی کہانی میری تھی۔ جس کے لیے دو ایک گانوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ میرا جی کو کچھ روپے مل جائیں اس سے یہ گانے لکھنے کے لئے کہا۔ جو اس نے دیں بیٹھے بیٹھے لکھ دیے۔ مگر کھڑے کھڑے قسم کے، نہایت دابیات جو یکسر غیر فنی تھے۔ میں نے جب اس کو اپنا فیصلہ سنایا تو وہ خاموش رہا۔ واپس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے سات روپے طلب کئے کہ اسے ایک ادھا لینا تھا۔

اس کے بعد بہت دیر تک اس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرم ہو گیا۔ میں خود بوتلی کا رس بنا تھا۔ یہ منہ نہ لگے تو جی پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا مجھے بخوبی علم تھا۔ اس لیے میں اس رقم کا انتظام کر رکھا۔ سات روپے میں دم کا ادھا آتا تھا، باقی آٹھ آنے اس کے آنے جانے کے لئے ہوتے تھے۔

بارشوں کا موسم آیا۔ تو اسے بڑی دقت محسوس ہوئی۔ یہی میں اتنی شدید بارش ہوتی ہے کہ آدمی کی جڑیاں تک بھیگ جاتی ہیں۔ اس کے پاس فالٹو کمپٹرے نہیں تھے۔ اس لیے موسم اس کے لیے اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اتفاق سے میرے پاس ایک برساتی تھی۔ جو میرا ایک جٹا کٹا فرجی دوست صرف اس لیے میرے گھر بھول گیا تھا۔ کہ وہ بہت وزنی تھی۔ اور اس کے کندھے شل کر دیتی تھی۔ میں نے اس کا ذکر میرا جی سے کیا۔ اور اس کے وزن سے بھی اس کو آگاہ کر دیا میرا جی نے

کہا: کوئی پروا نہیں، میرے کندھے اس کا بوجھ برداشت کر لیں گے، چنانچہ میں نے وہ برساتی اس کے حوالے کر دی۔ جو ساری برسات اس کے کندھوں پر ہی مرحوم کو سند سے بہت دلچسپی تھی۔ میرا ایک دور کا دوست دار اشرف ہے۔ وہ ان دنوں پائلٹ تھا۔ جو ہر میں سندھ کے کنارے رہتا تھا۔ یہ میرا جی کا دوست تھا۔ معلوم نہیں ان کی دوستی کی بناء کیا تھی۔ کیونکہ اشرف کو شہر و شامری سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ بہر حال میرا جی اس کے ہاں رہتا تھا۔ اور دن کو اس کے حساب میں بیٹا تھا۔

اشرف جب اپنے بھونپڑے میں نہیں ہوتا تھا۔ تو میرا جی ساحل کی نرم زم اور گیلی گیلی ریت پر وہ برساتی بچھا کر لیٹ جاتا اور مہم شعر فکر کیا کرتا تھا۔

ان دنوں ہر اتوار کو جو ہر جانا اور دن بھر پٹیا میل معمول سا ہو گیا تھا۔ دو تین دوست اکٹھے ہو کر صبح نکل جاتے اور سارا دن ساحل پر گزارتے۔ میرا جی وہیں مل جاتا۔ اوٹ ٹانگ قسم کے مشاغل رہتے۔ ہم نے اس دوران میں شاید ہی کبھی ادب کے بارے میں گفتگو کی ہو۔ مردوں اور عورتوں کے عین جو تھا ٹی ٹکے جسم دیکھتے تھے۔ وہی بڑے اور چاٹ کھاتے تھے، ناریل کے پانی کے ساتھ شرب لاکھ پیتے تھے۔ اور میرا جی کو وہیں چھوڑ کر واپس گھر چلے آتے تھے۔

اشرف کچھ عرصے کے بعد میرا جی کا بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ خود مینا تھا مگر اپنی حقیرہ حد سے آگے نہیں جڑتا تھا۔ لیکن میرا جی کے متعلق اسے شکایت تھی۔



کہ وہ اپنی حد سے گزر کر ایک اور حد قائم کرتا ہے۔ جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ بے ہوش پڑا ہے، مگر اور مانگے جا رہا ہے۔ اپنی اس طلب کا دائرہ بناتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اسے کہا ختم ہونا تھا۔ مجھے اس کی شراب نوشی کے اس پہلو کا علم نہیں تھا۔ لیکن ایک دن اس کا تجربہ بھی ہو گیا جس کو یاد رکھنے کے لیے آج بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔

سخت بارش ہو رہی تھی۔ جس کے باعث برقی گاڑیوں کی نقل و حرکت کا سلسلہ دم بدم ہو گیا تھا۔ خشک دن، ہونے کی وجہ سے شہر میں شراب کی دکانیں بند تھیں۔ مضافات میں صرف باغیچہ ہی ایک ایسی جگہ تھی۔ جہاں سے مقررہ دھول پر یہ چمیر لی سکتی تھی۔ میرا جی میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میرا بڑا ماش گوسایا من عباس جو دہلی سے میرے ساتھ چند دن گزارنے کے لئے آیا تھا۔ ہم تینوں باغیچہ اتر گئے۔ اور ڈیڑھ بوتل روم خرید لی۔ واپس اسٹیشن پر آئے تو صاحب دہدی ملی خان مل گیا۔ میری بیوی لاہور گئی ہوئی تھی۔ اس لئے پروگرام بن کر میرا جی، اور صاحب دہات میرے ہی ان رہیں گے۔

ایک بجے تک روم کے دور چلتے رہے، پڑی بوتل ختم ہو گئی۔ صاحب کے لئے دوپگ کافی تھے۔ ان کو ختم کر کے وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور فلمی گیت گانے کی پریکٹس کرتا رہا۔ میں من عباس اور میرا جی پیٹے اور فضول فضول باتیں کرتے رہے۔ جن کا سر تھا۔ پیر کر شیر کے باعث بازو منساں تھا۔ میں نے کہا اب سونا چاہیے۔ عباس اور صاحب

میرے اس فیصلے پر صا د کیا۔ میرا جی نہ مانا۔ اقدھ کی سوجھی اس کے علم میں تھی۔ اس لیے وہ اور پتیا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، میں اور عباس صند میں آگئے اور وہ ادا تھا کھوٹنے سے انکار کر دیا۔ میرا جی نے پہلے منقش کیں۔ پھر حکم دینے لگا۔ میں اور عباس دونوں انتہا درجے کے سفتے ہو گئے۔ ہم نے اس سے ایسی باتیں کیں کہ ان کی یاد سے جیسے خامت عسویں ہوتی ہے۔ لڑ جیگڑا کہ ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں صبح خیر ہوں سب سے پہلے اٹھا اور ساتھ والے کمرے میں گیا۔ جس نے رات کو راجہ سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ میرا جی کے لئے اسٹریچر بچا دے۔ اور خود صوفے پر سو جائے۔ راجہ اسٹریچر میں بالاب بھرا تھا۔ مگر صوفے پر میرا جی موجود نہیں تھا مجھے سخت حیرت ہوئی۔ غسل خانے اور باورچی میں دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ نامرمانی کی حالت میں چلا گیا ہے چنانچہ وضو اتھا۔ معلوم کرنے کے لئے میں نے راجہ کو جگایا۔ اس نے بتایا کہ میرا جی موجود تھا۔ اس نے خود اُسے صوفے پر لٹایا تھا۔ ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ میرا جی کی آواز آئی: "میں یہاں موجود ہوں۔"

وہ فرش پر راجہ ہمدی علی خان کے اسٹریچر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اسٹریچر اٹھا کر اس کو باہر نکال لایا۔ رات کی بات ہم سب کے دل و دماغ میں عود کر آئی لیکن کسی نے اس پر تبصرہ نہ کیا۔ میرا جی نے مجھ سے آٹھ آنے لیے اور بھاری بھر کم

برساتی اشاکر چلا گیا مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ اور اپنے ہر بہت قصہ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں خود کو بہت لعنت لعنت کی کہ میں رات کو ایک نکلی می بات پر اس کو دیکھ پہنچانے کا باعث بنا۔

ایس کے بعد بھی میرا جی مجھ سے متا رہا۔ علم اند شری کے حالات منتقب ہو جانے کے باعث میرا اتھ تنگ ہو گیا تھا۔ اب میں ہر روز میرا جی کی شراب کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا لیکن اس کو علم ہو گیا تھا چنانچہ ایک دن مجھے اس سے معلوم ہوا کہ اس نے شراب چھوڑنے کے قصد سے جنگ کھانی شروع کر دی ہے۔

جنگ سے مجھے محنت نفرت ہے ایک دوبارہ استعمال کرنے سے میں اس کے ذات آفریں نشے اور اس کے رد عمل کا تجربہ کر چکا ہوں۔ میں نے میرا جی سے جب اس کے بارے میں گفتگو کی تو اس نے کہا: "نہیں... میرا خیال ہے۔" فٹہ بھی کوئی بڑا نہیں، اس کا اپنا رنگ ہے۔ اپنی کیفیت ہے۔ اپنا مزاج ہے۔

اس نے جنگ کے نشے کی خصوصیات پر ایک پیکر سا شروع کر دیا۔ افسوس ہے کہ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میں اپنے دفتر میں تھا اور آٹھ دن کے ایک شکل باب کی نظر نویسی میں مشغول تھا۔ اور میرا دماغ ایک وقت میں صرف ایک کام کرنے کا عادی ہے۔ وہ باتیں کرتا رہا اور میں مناظر سوچنے میں مشغول رہا۔

بٹنگ پینے کے بعد دماغ پر کیا گزرتی ہے۔ مجھے اس کے تعلق صرف اتنا ہی علم تھا کہ گرومیش کی چیزیں یا تو بہت چھوٹی ہوجاتی ہیں۔ یا بہت بڑی آدمی حد سے زیادہ ذکی الحق ہوجاتا ہے۔ کانوں میں ایسا شور مچتا ہے۔ جیسے ان میں سورہے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ دریا پانی کی ہلکی سی ٹیکریں جاتے ہیں اور پانی کی ہلکی سی ٹیکریں بیت بڑے دریا۔ آدمی ہنسا شروع کرے تو ہنستا ہی جاتا ہے۔ روٹے تو روتے نہیں تھکتا۔

میراجی نے اس نشتے کی جو کیفیت بیان کی وہ میرا خیال ہے اس سے بہت مختلف تھی۔ اس نے مجھے اس کے مختلف مذاہج بتائے تھے۔ اس وقت جبکہ وہ بٹنگ کھائے ہوئے تھا۔ غالباً لہروں کی بات کر رہا تھا۔ سورہ کچھ گرا بڑ سی ہوئی۔۔۔ کوئی چیز اور سے اُدھر کی چیزوں سے مل جا کر اُدھر کو اٹھی۔۔۔ نیچے آگئی۔۔۔ پھر گڑ بڑ سی ہوئی۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔۔۔ دماغ کی نایموں میں بیت گئے لگی، سرسراہٹ محسوس ہورہی ہے۔۔۔ پر بڑی نرم نرم۔۔۔ پہلے نرم تھا۔۔۔ پورے اعلان کے ساتھ۔۔۔ اب یہ فٹنے میں تبدیل ہو رہا ہے۔۔۔ دھیرے دھیرے۔۔۔ ہوسے ہوسے۔۔۔ جیسے آبی گدگدے پھنپھن رہی ہے۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ زور سے میاؤں ہوئی۔۔۔۔۔ لہر ٹوٹ گئی۔۔۔۔۔ غائب ہو گئی۔ اور وہ چونک پڑتا۔

خوڑے وقفے کے بعد وہ پھر یہی کیفیت نئے سرے سے محسوس کرتا۔

اب پھر نون کے اعلان کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گڑ بڑ شروع ہو گئی ہے۔۔۔۔۔  
 اس پاس کی چیزیں یہ اعلان سننے کے لئے جمع ہو رہی ہیں۔ کانا پھوسیاں بھی  
 ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔ ہو گیا۔۔۔۔۔ اعلان ہو گیا — نون اور پرکراٹھا۔۔۔۔۔  
 آہستہ آہستہ نیچے آیا۔۔۔۔۔ پھر وہی گڑ بڑ — وہی کانا پھوسیاں۔۔۔۔۔  
 اس پاس کی چیزوں کے هجوم میں نون نے انگریزی ٹی اور ریٹینے لگا۔۔۔۔۔ غصہ  
 کھج کر لمبا ہوتا ہوا رہا ہے۔۔۔۔۔ کوئی اسے کوٹ رہا ہے، روٹی کے تھوڑے سے  
 ۔۔۔۔۔ حنر میں سنائی نہیں دیتیں، لیکن ان کا ننھا منا، پر سے بھی ہلکا لمس  
 محسوس ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ غوں، غوں، غوں۔۔۔۔۔ جیسے بچہ ماں کا دودھ پیتے  
 پیتے سو رہا ہے۔۔۔۔۔ ٹھہرو، دودھ کا بیلہ بن گیا ہے۔۔۔۔۔ روہ پھٹ بھی  
 گیا۔۔۔۔۔ اور وہ پھر چمک پڑا۔

مجھے یاد ہے، میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اپنے اس تجربے، اپنی اس  
 کیفیت کو اشعار میں من رعن بیان کرے۔ اس نے وعدہ کیا تھا، معلوم نہیں اس  
 نے ادھر توجہ دی یا بھول گیا۔

کمزور کرید کریم کسی سے کچھ بچھا نہیں کرتا۔ سرسری گفتگوؤں کے دوران  
 میں میراجی سے مختلف موضوعوں پر تبادلہٴ خیالات ہوتا تھا، لیکن اس کی ذاتیات  
 کبھی سرخ گفتگو میں نہیں آتی تھی۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کس سلسلے میں اس کی  
 اجابتِ جنسی کے خاص ذریعے کا ذکر آ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا، اس کے لئے

اب مجھے خارجی چیزوں سے مدد دینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسی فلمیں  
جن پر ٹیل آٹا رہا ہوا ہے۔ . . . . خون میں قطرہ جی ہوائی خاموشیاں . . . . .

یہ سچی کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ میرا جی کی ضلالت اب اس انتہا کو پہنچ گئی  
ہے کہ اسے خارجی ذرائع کی امداد طلب کرنا پڑ گئی ہے۔ اچھا ہوا جو وہ جلد ہی مر گیا  
کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں  
رہی تھی۔ وہ اگر کچھ دیر سے مرنے پر یقیناً اس کی موت بھی ایک دردناک ابہام  
میں جاتی۔

---

## باری صاحب

مستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرت ناک انجام  
دوس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام  
زاریت کے تابوت میں آہندی کیل

ان تین جلی سرخوں کے قد آدم اشتہار امرتسر کی متعدد دیواروں پر  
چسپاں تھے۔ لوگ زیادہ تر صرف یہ سرخیاں ہی پڑھتے تھے۔ اور آپس میں چہ میگوئیاں  
کرتے چلے جاتے تھے معلوم نہیں سن کر ناستا۔ مگر موسم گرفتاریوں کا تھا اور ایسے  
موسم امرتسر میں گتے ہی رہتے تھے۔ غالباً ان دنوں یوں کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں  
خط ڈالنے والے لال لال بیگلوں میں آگ لگنے والی چیزیں ڈالنے کا شغل بھی جاری  
تھا۔ قضا خاص بھی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ اشتہار جو امرتسر کی دیواروں پر جاکیا

## مجھے فرشتے

چہاں تھے۔ پاس سے گزرنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے تو رخے مگر وہ جلدی جلدی نظروں سے اشتہار کی عبارت کے چند نواسے اٹھا کر اپنا رستہ پکڑتے تھے کہ کہیں اسی جرم میں نہ دھریے جائیں۔

یہ اشتہار آسکر ولڈ کے ایک گھٹیا سے ڈرامے ڈیرا کے اردو ترجمے کا تھا جو میں نے اور میرے گلگرمیے حسن عباس نے مل کر کیا تھا۔ اور اصلاح اختر شیرانی سے لی تھی۔ ہادی صاحب نے جو میرے اور حسن عباس دونوں کے گرو تھے اسی ترجمے میں ہادی ثری مدد کی تھی۔ کتاب ہم نے خود سنائی۔ بمقام پریس میں چھپوائی تھی ہادی صاحب اس کے تمام کمرے خود اپنے کندھوں پر لادوا کر گھر لائے تھے تاکہ محفوظ رہیں۔ ان کو خطرہ تھا کہ پولیس چھاپہ مار کر پریس میں سے سادی کتاب اٹھالے جائے گی۔ میرے اور حسن عباس کے لئے یہ سب سلسلہ بڑا دلچسپ اور حیرت بخش تھا۔ جیل میں کیا کیا صعوبتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ تھانوں میں کیا دنگت ہوتی ہے۔ اس کے متعلق مجھے کچھ پڑجوش اور کھنڈر سے داغ کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر قید ہو گئے تو یہ وطن کے لئے بڑی قربانی ہوگی۔ رٹا ہو کر آئیں گے تو لوگ ہار پہنائیں گے اور جیوس نکالیں گے۔

ڈرامہ، درس کے دہشت پسندوں اور نرجسوں کی سرگرمیوں کے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ امرتسر میں ان دنوں اگر کوئی ہوائی بمباری سے بے مسلح ہونا چاہتا تو قیامت اُسے توپ دم کر دیا جاتا۔ کہاں اسکو، کہاں امرتسر



گرمیں اور جن عباس نئے نئے باغی نہیں تھے دوسری جماعت میں دنیا کا نقشہ نکال کر ہم کئی بار خشکی کے رستے روس پہنچنے کی ایکسپیں بنا چکے تھے۔ حالانکہ ان دنوں قیروزالین مسکور بھی کامریٹ ایف، لوسی مسکور نہیں بنے تھے۔ اور کامریٹ سجاد ظہیر سرٹا بنے میاں ہی تھے ہم نے امرتسری کو مارا سکو مقصود کر لیا تھا۔ اور اسی کے لگی کوچوں میں مستبد اور جابر حکمرانوں کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ کٹر وہ جمیل سنگھ، کرموں غازیوڑھی ریاء، چوک فرید میں زآریت کا تابوت گھسیٹ کر اس میں آخری کیل ٹھوکنے چاہتے تھے۔ بیکل ٹیرٹھی بوجاتی یا تھوڑے کی ضرب اُس کے بجائے ہماری کسی انگلی کو زخمی کر دیتی۔ اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ — باری صاحب —

۱۰ اشتر کی ادیب باری ہمارے گرد تھے۔ سوچنا ان کا کام تھا۔ لیکن مجھے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ یہ آدمی جس کو ہم نے اپنا رہنا بنایا ہے۔ بڑے کمزور دل کا آدمی ہے۔ ذرا سا پتا کھڑکتا تھا۔ تو وہ چونک پڑتے تھے۔ پر ہماری پُر خلوص گر بخوشی ان کے متزلزل قدموں کو ہمیشہ مضبوط بنا دیتی تھی۔

اب سہرا جانے تو اس زمانے کی سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت یہ کھلونے ہی عظیم المیہ اور قری بیگل تھے۔ ان سے چہرہ لڑانا گویا کسی دیر سے نذر آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی تہری اگر بزدل نہ ہوتے تو قیقنا ہم چاروں (کچھ عرصے کے بعد ابو سعید قریشی بھی ہمارے گھر سے) میں شامل ہو گیا تھا، اسی لڑنے میں ان کھلونوں سے اپنا ہی بھلانے کے جرم میں

پھانسی پانگئے ہوتے اور انٹرنس کی پوری تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اعتراف ہو گیا، جتنا جواب غموس دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رُخ کا بھی صحیح علم نہیں تھا۔

میں نے باری صاحب کو بزدل کہا ہے ان کی شخصیت پر کسی محلے کی غرض سے نہیں، اصل میں ان کی شخصیت کی ترتیب و تدوین میں اس بزدل کا بہت سا حصہ تھا اگر کسی وجہ سے ان کے مافی البدنی نظام سے یہ کمزوری نکل جاتی تو وہ، وہ باری نہ ہوتے جو وہ تھے۔ ان کا شخص باطلِ خدا قسم کا ہوتا۔ ہو سکتا ہے وہ بالی کے مشہور عالم کھلاڑی ہوتے اور دوسرے نامور کھلاڑیوں کی طرح ان کی عمر کسی ریاست کی نوکری میں گزرتی رہے، ہو سکتا تھا کہ وہ پرائمری اسکول کے استاد سے ترقی کرتے کرتے کسی یونیورسٹی کے ریڈر ہو جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جگت سنگھ کی طرح بجاڑ ہوتے، جگت سنگھ اپنی کے ضلع یعنی لاہور کا رہنے والا تھا۔ اور باری صاحب اُس کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ صرف بزدلی ہی کا باعث ہے کہ وہ ہمیشہ ادھر کے رہے، نہ اُدھر کے، ساری عمر جہاں رہے ملحق رہے اور میں تو سمجھتا ہوں اس دوران میں ان کے بلا کے تیز و تار میں جو خیال بھی پیدا ہوا۔ بزدلی کی کھونٹی سے لگا رہا۔

باری صاحب بڑی بڑی نرالی باتیں اور اکیبیں سوچتے رہے ایسی جو کسی اور کے ذہن میں آسانی کے ساتھ نہیں آ سکتیں۔ مگر یہ اتنی مرحمت سے غائب ہو جاتی تھیں

کہ اُن کے آثار تک بھی نہ رہتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ انہوں نے زندگی کے مسند میں اچانک کسی دلچسپ ٹاپر کی موجودگی کا انکشاف کیا، اس کو سر کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر عمل میں لائی جاتی چاہیں۔ سب کی سب سمجھا دیں۔ وہاں پہنچ کر جو تختیں اور گھڑی ہوئی درمیں تیسرا آئیں گی، اُن کی تصویر کشی بھی کر دی۔ سننے والے کے ہر ذرہ کو اس ہم کے لئے تیار ہو گئے۔ ان میں سے کچھ رخصت سفر یافتہ کر دیا بھی ہو گئے لیکن جب منزل کے دیکھا تو باری صاحب غائب۔۔۔۔۔ واپس آکر ان سے استفسار کرنا چاہا۔ تو انہوں نے کسی اور دلچسپ جزیرے کا ذکر چھڑ دیا۔ جو وہ اس قدر دل میں دریافت کر چکے تھے۔

مذکورہ صدر اشتہار چسپاں کرنے کے بعد چنانچہ یہی ہوا۔ میں اور عباس دونوں مات بھر گرفتار ہو جانے کی سنی کے ساتھ آدمے سوئے، آدمے جاگتے رہے دوسرے روز نئے نویں دو لہروں کی طرح ہم تھرپاکا رباری کوڑھونڈتے رہے کہ اُن سے پوچھیں۔ آگے کیا ہوگا، مگر وہ غائب تھے۔ دو تین چکیں تھیں جہاں وہ جاتے تھے۔ مگر اندر سے کسی ایک پر بھی وہ موجود نہیں تھے پندرہ بعد کے بعد اچانک نو وار ہونے تو انہوں نے ایک تھقہ دار پرچہ جاری کرنے کی اسلیم سے ہمیں اپنے مخصوص انداز میں مطلع کیا۔ ہم آپ کی طرح بیکار نہیں تھا۔ سارے انتظامات مکمل کر لئے ہیں بس ٹرانزیشن داخل کرنا ہے۔ معنوں میں آج ہی سے مکنا شروع کر دیا گا۔

آخر سر کی دیواروں پر نازت کے تابوت میں آخری کیل سنوٹنے والے ختم ہو چکے

## گنجے فرشتے

تھا کھڑ گئے۔ اور کچھ قریبِ مردمی کی دواؤں کے پوسٹروں تلے دب گئے اور ہمارا جوش اور صبر سے متعلق ہر کمرہ بندہ دار پہچنے کی ابتدائی کارروائیوں میں داخل ہو گیا۔

”ویرا“ ناقص کتابت اور دواہیات طباعت کے باعث میرے گھر میں مقفل پڑی رہی۔ لیکن ”خلق“ کے صوری حتمی کے لئے ہم نے اپنی پہلی فروگزاشتوں سے فائدہ اٹھایا۔ جب اس پہچے کا پہلا شمارہ ثنائی برقی پریس سے میں اور باری صاحب کندھوں پر اٹھا کر گھولائے تو اس کی گروا کتابت و طباعت سے ہم بیت مطمئن تھے۔

باری صاحب کے ایک کرم فرما تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں، لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ سیاہ دائرہ والے ایک صاحب تھے جو غائبانہ چہرے کے سوداگر تھے۔ خلق کے اجراء میں مالی ہمتدان کا تھا۔ وہ اور بھی سرمدیہ لگنے کے لئے تیار تھے، مگر باری صاحب میدان چھوڑنے کے بھاگ گئے۔

پہلے شمارے میں سرورق پر ان کا ایک مستنون تھا، ہیگل سے لے کر کادل بارکس تک۔ ایک مختصر سا خاکہ تھا۔ اشتراکی فلسفے کے ارتقاء کے بارے میں جو میسر ہی تھی۔ صن عباس کی فہم سے بالاتر تھا۔ اصل میں ہم ہیگل سے واقف تھے، کادل بارکس سے آخرالذکر کا نام باری صاحب سے کئی مرتبہ سنا تھا، جس سے ہم کو اتنا معلوم تھا کہ وہ مزدوروں کا بہت بڑا حامی تھا۔ اس کا خط کیا تھا۔ اور اس کے ڈانڈے حکیم ہیگل سے کہاں اور کیوں کرتے تھے۔ ایمان کی بات ہے۔ اس کے متعلق ہماری معلومات صفر تھیں۔ اچھے انسانوں کے تالیفین کی رپسی کے لئے ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ کہ

میرا سب سے پہلا طبع زاد افسانہ "تماشا" کے عنوان سے "خلق" کے اسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس پر اپنا نام نہیں دیا تھا۔ اس لمحہ سے کہ لوگ مذاق اڑائیں گے۔ ان دنوں میرے جاننے والے انڈیا تو سفر میری سقیم تحریریں پر خوب ہنسا کرتے تھے لیکن عجیب بات ہے کہ باری صاحب نے جن کو میری محدود علمیت کا پتہ تھا میری ہیشہ حوصلہ افزائی کی۔ یہاں تک کہ مجھے میری غلطی سے بھی کبھی روشناس نہ کیا وہ کہا کرتے تھے: "سب لیک ہے؟"

بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ مجھے باری صاحب کے میدان چھوڑ کر جاگ جانے کے شوق کچھ کہنا تھا: "خلق" کا پہلا شمارہ شائع ہوا، تو چند روز بڑے جوش و خروش میں گزریا، میں اور ہماس یوں محسوس کرتے تھے، جیسے ہم سے کوئی بڑا کاروبار سرزد ہو گیا ہے کہ ٹکڑوں میں سٹکھ اور مال بازار میں ہم ایک نئی شان سے چلتے سٹکھ۔ لیکن آہستہ آہستہ ہمیں محسوس ہوا کہ اس تسرکی نظروں میں ہم ویسے کے ویسے آوارہ گرد ہیں۔ پان سگڑت واسے بستور اپنے پیروں کا تھکا کرنے اور خاندان کے بھنگہ برابر اپنا وہی فیصلہ سناتے تھے کہ ہمارے تھکن اچھے نہیں سٹھن ذاتی کچھ اچھے نہیں تھے۔ اس لئے کو خنبہ پولیس نے پوچھ گچھ شروع کر دیا اور اسی سلسلے میں کرچہ دکیلاں تک پہنچ گئی۔ میرے بہنوئی خواجہ عبدالحمید صاحب ان دنوں نئے نئے ریٹائر ہوئے تھے۔ آپ ایک عرصے تک پھلوں کے پولیس اسکول میں اسٹاک رو رکھتے تھے۔ اس لئے پنجاب پولیس کے قریب قریب تمام آدمیوں کو جانتے تھے۔

خیبر پولیس کے سپاہی جب باری صاحب کا آنا پتا معلوم کرنے کے لئے کوچ و کیلاں میں پہنچے تو ان کی خواجہ صاحب سے مل بیٹھ رہی تھی۔ وہ باری صاحب کا وہ خطرناک معنوں میں ہیکل سے کامل مارکس تک پڑا چکے تھے۔ اس کے علاوہ باری صاحب کو بھی اچھی طرح جانتے تھے اور تاریخ سے جو ان کو دلچسپی تھی۔ اس کی تعداد کرتے تھے۔ ان کا انداز بیان جو خطیبانہ ہوا کرتا تھا۔ انہیں پسند تھا۔ اس لئے انہوں نے خیبر پولیس کے سپاہیوں سے کہا: "جاؤ! کوئی اور کام کرو۔ ہیکل اور کامل مارکس تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔" غریب باری بھی ابھی تک ان کے فلسفے کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔

خواجہ صاحب نے جب ان کو یقین دلایا کہ معنوں میں کوئی بغاوت انگیز چیز نہیں جس سے سرکارِ برطانیہ کا تختہ اٹھنے کا اندیشہ ہو۔ تو وہ چلے گئے۔ لیکن جب باری صاحب کو اس کا پتہ چلا کہ حکومت کی مشینری حرکت میں آگئی ہے۔ تو انہوں نے "خلق" کا صرف دوسرا پارچہ نکالا اور اسے میرے پاس چھوڑ کر کہیں نامب ہو گئے اور بہت دیر تک معلوم نہیں کہاں کہاں گھومتے رہے مجھے یاد ہے کہ ان کا ایک کارڈ ملان سے آیا تھا۔ جس میں کچھ اس قسم کا معنون تھا: "ملتان کی روڈ گاہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کرو رہا ہوں۔"

یہ عجیب بات ہے کہ گردش کے دوران میں جب کبھی ان کا خط کسی شہر سے آتا تھا تو اس میں یہ اطلاع انہی الفاظ میں ضرور ہوتی کہ وہ اس کی روڈ گاہوں

اپنے ستاروں و نجوم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ مطالعہ میرا خیال ہے۔ وہ ہراسٹس گلی  
برائٹ کوپے کی رصدگاہ میں کستے رہے جہاں انہوں نے کچھ عرصے کے لئے قیام کیا قبر  
کی تاریک رصدگاہوں میں بھی وہ یقیناً ان ہی ستاروں کے مطالعے میں مصروف  
ہوں گے۔ مگر انوس ہے کہ وہ یہاں سے مجھے کوئی ٹاک کارڈ نہیں بھیج سکتے۔

مرحوم کو ٹاک کارڈ بہت پسند تھے۔ اس لئے کہ غافروں کے مقابلے میں ان پر  
خرچ کم ہوتا ہے۔ اس کا جواب دینے کے معاملے میں وہ بہت سست تھے مجھے  
یاد ہے۔ ایک بار میں نے انہیں امرتسر سے پے در پے کئی خط لکھے۔  
جب کوئی جواب نہ آیا۔ تو میں نے پانچ پانچ پیسے کے ڈوٹکٹ ان کو روانہ کر کے  
اور یہ تاکید کی کہ وہ اب جواب ضرور دیں۔ ان کا جواب آیا۔ مگر ٹاک کارڈ پر لکھا تھا  
تہا ہے۔ بھیجے ہوئے ڈوٹکٹ میں نے بیچ ڈالے۔ ایک کارڈ خرید کر تمہیں مکھڑا ہوں  
کہ تمہارے سب خط مجھے مل چکے ہیں۔

مجھے بہت غصہ آیا، فوراً لاہور پہنچا، ارادہ تھا کہ ان کی طبیعت صاف کر  
دوں گا۔ مگر جب ہم حرب ہونٹل میں بیٹھے اور میں نے ان کی فریبل حرکت کے  
متعلق بات کرنا چاہی تو انہوں نے لاہور کی رصدگاہوں میں میرے ستاروں کا  
مطالعہ شروع کر دیا اور آخر میں فیصلہ ہوا۔ تم گھر کے معاملات ٹھیک ٹھاک کر کے  
لاہور چلے آؤ اور کسی اخبار میں ملازمت کر لو۔

ایسے کئی مرتبے آئے کہ میں نے بڑی سنجیدگی سے باری صاحب پر اپنی

گئے فرشتے

خفگی و ناراضی کا اظہار کیا اور وہ بھی اس اندازے کے ساتھ کہ انکی میری ٹمٹی ہو جائے  
مگر ان کی باتیں کچھ ایسی تھیں کہ مجھے غیر مسلح کر دیتی تھیں۔ مٹا مٹا گول چہرہ سیاہی  
مال گندی رنگ بہت بڑا سر، قد متوسط، کالے کالے ہونٹ، مسوڑھے بھی کالے  
مگر جب ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی تھی تو اس پاس کے تمام خط وخال  
اپنی سیاہ تباہ آواز چھینکے جو صدائوں کی ہی خشک سنجیدگی اور مسامت کا باعث ہوتی  
تھی صرف ان مسکراتے ہوئے لمحات کی رصدگاہوں میں وہ اپنے ستاروں کا مطالعہ  
نہیں کرتے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ صرف انہی لمحات میں ان کے مسلسل مطالعے سے  
اکٹائے ہوئے یہ ستارے بھی محفوظی دیر کے لیے مسکرا لیتے تھے۔

باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کہا لیتے تو ڈرتے  
رہتے تھے کہ ان کی تووند نکل آئے گی۔ حالانکہ فاتور کے زمانے میں ہی ان کے جسم کا یہ  
حصہ بڑھتا رہا۔ زیادہ نیز صبا لگے نہیں تھے کہ ان کے دل پر اس کا اثر پڑے گا۔  
حالانکہ ان کے جسم کے اسی ریش حضور نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی بڑی سرخ بجاوتوں  
کے نیسے نقشے تیار کرتے تھے۔ اور پٹانے کی آواز سن کر زرد ہر جاتے تھے۔ ان کو ایک  
ڑکی سے محبت تھی۔ لیکن ماں باپ کسی اور سے ان کا رشتہ پکا کر چکے تھے جب انکو  
معلوم ہوا کہ عشق فرما رہے ہیں تو انہوں نے شادی کی تاریخ پکڑ کر دی۔ باری صاحب  
ان دنوں یسے ساتھ رہتے تھے۔ جب تاریخ نزدیک آئی۔ قرفاٹ ہو گئے۔ لیکن  
کمرے کی ماں زیادہ دینک خیر نہ منا سکی۔ ان کی ہونے والی دو ماہن نے ایک بڑا مکر



کا خط لکھا جس میں یہ دھکی دھج تھی کہ اگر انہوں نے اس سے شادی نہ کی تو وہ ان کچھ پیٹ میں پھری بھونک دے گی۔ باری صاحب ڈانٹے اور شادی کر لی۔  
 برہا کی رسد گا ہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لئے نیچے تر وہاں ایک برہا کی کاندھ اُن کے ستاروں سے ٹکرا کر اُن میں الجھ گیا۔ آپ نے اپنی بیوی کو وہاں بجا لیا لیکن ستاروں کا الجھاؤ بدسترد قائم رہا۔ آخر جنگ چھڑنے پر ان کو ایک ہوتو ملا اور وہاں سے بھاگ آئے۔

بڑے دن چھوڑتے آدمی تھے۔ اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آ گیا تھا کہ اس کو اپنا اور حنا بھونا بنا لیا۔ مگر سردیوں میں معلوم ہوا کہ یہ کام نہیں دے سکتا۔ اقبال کے ارشاد کے مطابق انہوں نے اپنی خودی کو متحد و مبرا دیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی بھر باری تعالیٰ نے ان سے کہی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ اسے باری تعالیٰ نیری رضا کیا ہے آخر ایک دن وہ خود ہی اقبال سے پوچھنے لگے کہ یہ گڑ بڑ کیا ہے۔

ان دنوں باری صاحب کی اپنے اخبار کے دفتر میں رات پالی ہوتی تھی۔ آخری کالی پریس بھیج کر جب فارغ ہوتے تو علامہ اقبال مرحوم کی قبر پر چلے جاتے اور وہاں تک ان کی روح سے فلسفہ خودی پر بات چیت کرتے رہتے۔ بہت تنگ حال تھے تنخواہ کبھی مہیسی مٹی تھی۔ اور وہ بھی قسطوں کی صورت میں اخباروں کے مالک یہ سمجھتے تھے کہ ان کے لئے کے آدمی بار بار دار حیدر ان ہیں جسکو جو کچھ دے دیا جائے۔ وہی بہت ہوتا ہے باری صاحب حساس آدمی تھے۔ قرض لیتے تھے مگر بوجھ عموماً

کرتے تھے۔ خودی کو وہ کافی ہندی پرے لگے تھے۔ مگر اب اس میں اور زیادہ ہلکا  
 سنگ پینچنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی چنانچہ جتنا کہ علامہ کی قبر پر گئے اور ان کی روح  
 سے بڑے باغیاز سوال کرتے شروع کر دیئے۔ میرا خیال ہے اگر علامہ زندہ ہوتے تو  
 انہیں ان سوالوں کا جواب دیتے وقت بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔

بہادت کا یہ جوش بھی ان کے دل و دماغ میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اگر بزدل نہ ہوتے تو  
 میرا خیال ہے کہ عام انسانی زندگی پر اقبال کے فلسفہ خودی کے تطبیق و اطلاق کے  
 مسئلے پر یقیناً بصیرت افروز روشنی ڈال سکتے۔ مگر وہ تمام کونہیں جو ان کے حساس  
 دل و دماغ کی شاخوں سے جوش کے باعث پھوٹی تھیں، اس بزدلی کے باعث چھا  
 لگیں معلوم نہیں ان کے دوسرے دوست محمد سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن میں  
 سمجھتا ہوں۔ اگر وہ ثابت قدم ہوتے اور اگر دوپیش کی مخالفت قوتوں کا مقابلہ ڈٹ  
 کر کرتے تو ان کے قلم سے "انقلابِ فرانس" کے بجائے "انقلابِ ہندوستان" نکلتی اور  
 یہ بھی ممکن ہے کہ اٹھارہ سو ستاون کا تاتاریا ٹوپی ان کے قلوب میں دوسرا جنم لیتا۔  
 اقبال کی طرح وہ بھی خدا سے یہ کہتے رہے: "کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار  
 کر۔" مگر اس وقت جب کہ ان کو خدا کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آتا تھا۔ بس کہ  
 جب بلاوا آیا تو وہ کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر د کہہ سکے، اور اقبال  
 کے مانند چل دیے۔ وہ گنجشک فرمایہ کو شاہین سے لڑانے کے لئے تیار کرتے  
 رہتے۔ مگر جب اسے پالی میں آکر حملہ آتا تو پیجرہ وہیں چھوڑ کے بھاگ جاتے

اس غریب کو دو دو چھپیں لینے اور شکست کھانے کا بھی موقع نہ ملتا۔

باری صاحب خیالی پلاؤ پکانے کے سلسلے میں اول درجے کے بکاؤل تھے ایسے ایسے لذیذ پلاؤ اور بریاں تیار کرتے تھے کہ ان کا ذائقہ دیرینک و مزوں کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوتا تھا مجھے یاد ہے جب "خلق" دو اشاعتوں کے بعد انہوں نے بند کر دیا۔ اور چند اخباروں میں کام کرنے کے بعد انہیں کچھ حاصل حصول نہ ہوا تو انہوں نے ایک ہفتہ دار اخبار "موجنا" نکالنے کا ارادہ کیا اس کی سرخیاں کیسی مہوں گی مضامین کس نوعیت کے ہوں گے۔ اس کے متعلق انہوں نے گفتگوں کے ذریعے سے ایسی تصویر کشی کی کہ اس مجوزہ پرچے کے کئی شامے آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے اور دیرینک فصلٹے آسمانی سے ہم پر جو سن رہے تھے موجوں کی بارش ہوتی رہی ایک بداد و مصافحہ کے پچھے سے تنگ آئے تو جنگ کا یہ دستہ نکالا کہ وہ اسے چھوڑ چھاڑ کے چارہ کاشنے کی شین لگائیں گے اور مزے کی زندگی بسر کریں گے اس مزے کی زندگی کو انہوں نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے منصوبے انداز میں بیان کرنا شروع کر دیا جو میرے ذہن پر مرقم ہو گیا۔ چنانچہ بہت بعد میں جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا میں نے ایک ریڈیائی ڈرامہ "جرمنٹ" نے عنوان سے لکھا۔ اس کے مرکزی کردار کا نام باری ہی تھی جب یہ نشر ہوا تو ایک بھگم مرہا ہو گیا ہندوستان کے قریب قریب ہزار دو اخبار نے اس کے خلاف نوٹ لکھے اس لئے کہ اس سے اخبار کے مالکوں کی توہین ہوتی تھی لیکن ٹریڈ ہی سیہ

تھی کوئی مصافیوں سے اس کے خلاف نکھوایا گیا جن کی ناگفتہ بہ حالت کی حکمتی  
اس میں کی گئی تھی۔

یہاں پر اس ڈرامے کے چند اقتباس نقل کرنے شاید بے محل نہیں ہوں گے۔  
جورنلسٹ ہادی صحافت چھوڑ کر چارہ کاتھے کی مشین لگا لیتا ہے اور بہت خوش ہے  
اس کی خود کلامی ملاحظہ ہو۔

جادوی: رومنڈریٹھ دودھ پے کی آمدن ہو جاتی ہے۔ سارا دن یہاں دکان پر  
گھومتا ہوں۔ شام کو شیکے پر چلا جاتا ہوں اور گیس ڈانک کر پھر شہقا شہقا یہاں  
آ جاتا ہوں۔ نجری تر جھرتا پڑتی ہیں دکان کی جڑنا پڑتی ہے۔ شیفون کی بک  
بک د ماسلوں کی بکواس۔ کاتب ڈرائیٹش کی سروں۔ والٹڈیا گڑ بتایا ہے میرے  
دوست نے۔ سرویاں آئیں گی کرانڈگاس کے پاس چار پانی بچا لیا کروں گا۔  
کتنی اچھی زندگی ہے۔ میری قویہ مرضی ہے کہ سب ایڈیٹروں کو جو اخباروں میں  
اپنی زندگی تباہ کر رہے ہیں، یہ گڑ بتا دوں۔ اپنے اپنے شہر میں ایسی مشین لگوا  
لیں اسی جیسے رعائتہ دیں !

زندگی بڑی سہوار گند رہی تھی کہ اچانک دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اس کی  
اطلاع ہاری کو شراب خانے میں ملتی ہے اور اس کے دل و دماغ میں سو ہوا سمانی  
جاگ چڑھتا ہے اس کو بہت کوفت ہوتی ہے۔ جب وہ اس ہاس جینے جوئے ٹراپیوں  
کی گفت گوستا ہے جو بیروں سے منتقلی ہے تنگ آکر وہ چلا آٹھتا ہے۔

باری: خاموش۔ یہ تم نے کیا بکواس شروع کر دی ہے۔ تم لوگ باتیں بالکل جاہل  
 ہو رہے ہو۔ ایک ایسی جگہ شروع ہوئی ہے جو کئی ملکوں کو دنیا کے  
 نقشے سے ہمیشہ کے لئے مٹا دے گی۔ لاکھوں کروڑوں آدمی ہلاک ہو  
 جائیں گے۔ دنیا میں ایک طوفان بچ جائے گا اور تم لوگ بقیوں کی لڑائی  
 کا حال بیان کر رہے ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟  
 ایک ششراہی بکیا بکتا ہے یہ۔

دوسرا ششراہی: وقت بیکار کر میں تو کچھ رہیں — (بڑی سے) باری  
 — یہ کچھ تو کہیں باتیں بے بیجا ہے۔  
 پہلا ششراہی: زیادہ پی گیا ہے۔  
 دوسرا ششراہی: بڑی نامراد چیز ہے۔

باری: تم بکواس کرتے ہو۔ میں بالکل جھش میں ہوں۔ تم بے ہوش ہو رہے ہو۔  
 جو کچھ میں اس وقت سوچ رہا ہوں کہہنا ملک میں نہیں سوسکتا۔  
 پہلا ششراہی: ارے ارے واہ رے میرے مولوی۔

باری: تم میری باتوں کا مضحکہ نہ اڑاؤ رہتا ہے، مگر یہ تمہارا قصود نہیں،  
 میرا اپنا ہے۔ میں نے اب تک اپنی اصلیت تم سے چھپائے رکھی ہے۔  
 — تم نہیں جانتے میں کون ہوں اور سیاسی دنیا میں میری کس  
 قدر اہمیت ہے۔

پہلا شرابی :- میں تم دس مہینے بس اب جانے دو۔ کوئی اذیت کرو۔  
 بادی :- تمہیں جب تک میری اصل شخصیت معلوم نہیں ہوگی، تم میرا منگواؤ گے  
 دہرائے جانتے ہو میں کون ہوں۔ میرا نام عبدالبادی ہے۔ — — — مولانا  
 عبدالبادی روزنامہ "خلق" کا ایڈیٹر۔

اس آخری جلیں جوالیسہ پرشیدہ ہے وہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں بلکہ ہر دم  
 نے بااثر صافست چھوڑ دی تھی اور چارہ کاشے کی مشین لگا لی تھی مگر یہ مشین ان کی نہیں  
 سرکار پر ملائیم کی ملکیت تھی اور آخری دنوں میں ہر نفس انقور میں ڈیپارٹمنٹ میں غم  
 ہو گئے تھے اور گنگ اکثر ان کا منگواؤ گے تھے اس لئے کہ صدی عمر اگر بزرگ لایا دینے  
 کے بعد انہوں نے اس کی نوکری قبول کر لی تھی۔ لیکن وہ یقیناً دل ہی دل میں یہ ضرور چاہتے  
 رہے ہوں گے :- تمہیں جب تک میری اصل شخصیت معلوم نہیں ہوگی تم میرا منگواؤ  
 گے دہرائے دہرائے۔ — — — مگر یہ تمہارا قصور نہیں میرا اپنا ہے۔ — — — میں نے  
 اب تک اپنی اصلیت تم سے چھپائے رکھی؟

یہ میری اپنی تاویل و تعبیر ہے کہ بادی صاحب نے اپنی زندگی میں ہمیشہ فرار  
 کے واسطے اختیار کئے اور ان ماستوں پر بھی انہوں نے ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم  
 دکھائی ہیں وجہ ہے کہ ان کی روح لوگوں کی نگاہوں سے پرشیدہ رہی اور اس میں  
 قصور سراسر ان کا اپنا تھا۔ وہ جی جی چٹانوں سے ٹکر لینے کے لئے آگے بڑھتے  
 تھے۔ لیکن ان کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا تھا اور یہ سب کچھ ان کے اپنے دماغ میں

ہوتا تھا۔

اس ڈرامے میں باری ایک جگہ اپنی رد میں یہ کہتا ہے۔  
 باری :- پہلی جنگ سے لے کر اس جنگ کے آٹھ جنگ کے واقعات  
 کا اگر ہم پیش نظر رکھیں تو یہ معلوم کر کے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ مہذب  
 دنیاؤں کی دلدل میں وحش چھٹی ہے۔ سائنس کی ترقی جلدی رہی ہے  
 لیکن اخلاقی ذمہ داری کا احساس کم ہوتا چلا گیا ہے۔ نوع انسانی جہاں  
 تھی وہیں کی وہیں کھڑی ہے۔ نسل امتیاز اور مذہبی حدود بڑھتی  
 گئی ہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ پہلے جنگ نامہ صلح پہر  
 صلح نامہ جنگ — میں پڑھتا ہوں آخری ہندی مہذب دنیا کا حربہ  
 رہی ہے۔ کیا ہم پھر جدت کے زمانے میں جا رہے ہیں۔ کیا ایک بد پھر  
 انسان کا خون پانی سے بھی اوداں بنے گا — کیا پھر ہمارا گوشت  
 پرست دوسری اجناس کی طرح بازاروں میں بیچا جائے گا — ؟  
 — کیا ہونے والا ہے ؟ کوئی مجھے بتائے کیا ہونے والا ہے  
 بے اصول نے سینکڑوں اصول اور تفرقہ پر داندی لے ہزاروں  
 جماعتیں پیدا کر دی ہیں۔ انسان انسان کے خلاف۔ ملت ملت سے  
 خیر دانا — ملک ملک سے تینو کار — یہ ہے امیریں  
 صدی کی داستان :-

یہ خیالات ہر ٹرینڈرسل کے ہیں جو میں نے باری صاحب کے مخصوص خلیہ دار انداز میں مکالمے کی شکل میں تبدیل کر دیئے تھے باری صاحب کا دماغ ہر ٹرینڈرسل کے دماغ سے کم نہیں تھا لیکن وہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جس کے انجائوں کے مالکوں سے تنگ آکر انہیں کتنی باریہ کہنا پڑا تھا۔

باری بہ آپ قوم کی خدمت کرتے ہیں میں قوم کی اور انجاء کی خدمت کرتا ہوں لیکن اس خدمت کا معاوضہ مجھے وقت پر کبھی نہیں ملتا بلکہ یوں کہیے کہ ملتا ہی نہیں۔ چار مہینے میں آپ نے صرف سولہ روپے دیئے ہیں۔ خدا کا خوف یکبخت۔ میں انسان ہوں پتھر نہیں ہوں مجھے جھوک بھی لگتی ہے کبھی کبھی مٹھائی کھانے کو بھی جی چاہتا ہے مجھے آپ نے اس احمدا کا ایڈیٹر بنایا تھا۔ سیاسی یا سادھو نہیں بنایا تھا جو میں نے دنیا تیلاگ دی ہو!

چار ماہ کے عرصے میں صرف سولہ روپے! مگر یہ ہے یہ مبالغہ آرائی ہو مگر واقع ہے کہ جب وہ روزنامہ احسان میں کام کرتے تھے تو انہیں دفتر سے روزی چکر کراپنے اخراجات پر دے کرنے پڑتے تھے۔ ان دنوں راجہ سہدی علی خاں بھی وہیں ملازم تھے۔ باری صاحب آدمی بڑے غصے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ روزی بیچ کر کچھ کچھ وصول ہو جاتا ہے تو انہوں نے راجہ کو بھی اس ویسے سے آگاہ کر دیا باری صاحب طبعاً اعتدال پسند اور محتاط تھے لیکن روپیہ دھڑے کا آدمی تھا اس نے ایک دو بار تو صرف ہنڈل چلائے اس کے بعد اس نے باری صاحب سے



کہا: "یہ خوردہ فردوسی غلط ہے مولانا — میں کل دو بوریوں لاؤں گا انہیں بھر کر لے جائیں گے۔"

باری صاحب ٹنڈ گئے، لیکن راجہ صاحب نے ان کو اس جڑی ڈھکیٹی پر آمادہ کر لیا۔ باری صاحب پہرہ دیتے رہے اور راجہ بوریوں میں دوسری بھرتا رہا۔ مزدور بلائے گئے اور انہیں اٹھوا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ راجہ کا بیان ہے کہ یہ دونوں نے سینا دیکھا تھا۔

راجہ مہدی علی خاں سے روایت ہے کہ ان دونوں کو ایک دفعہ بازاروں میں بھیک مانگنی تھی پڑی تھی۔ اسیکم باری صاحب نے بنائی تھی لوگوں کے آگے دست سوال کیوں کروا دیا جائے گا۔ مسکین اور قابل جسم شکل و صورت کیسے بنائی جائے گی اپنا دکھڑا کس انداز سے اور کن الفاظ میں سنایا جائے گا یہ سب باری صاحب نے خود سوچا اور مرتب کیا تھا۔ لیکن جب جھولی پھیلانے کا موقع آیا تو باری صاحب جھینپ گئے اور بیشک دودھال آئے جی کر سکے۔ اس کے برعکس راجہ نے پونے تین دوپے اکٹھے کئے۔

یہاں راجہ کے بیان کے ہوتے ایک لطیفہ کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

خالیات نارنگی میں راجہ بھیک مانگ رہا تھا سانسے ایک گوبر سر پر دودھ کا بہت بڑا دھونڈا اٹھائے چلا آ رہا تھا راجہ نے جو باری صاحب سے انسانی نفسیات پر کچھ ٹیکریشن چکا تھا اندازہ لگا لیا کہ اسامی مالدار ہے اگر میں اس سے اپنی حالت زار

بیان کروں گا۔ تو اس کا دل ضرور میسج جانے لگا۔ راجہ کا خیال تھا کہ اس سے کم از کم ایک روپیہ تو ضرور مل جائے گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا۔ باری صاحب نے جو کچھ بتایا تھا بڑے غلوں کے ساتھ گوجر کرنا بابا اس کے راجہ سے کہا: "خدا یا تم دینا میرے دل سے کہو" راجہ نے کافی زور صرف کر کے اس کے سر کا بوجھ اتارنے میں مدد دی جب لٹوٹا اتر گیا تو گوجر نے اپنے ہمند کا ڈب کھولا۔ اس میں کئی نوٹ اور ہیٹ سا کرپا نہ تھا لیکن اس نے ان میں سے صرف ایک پیر نکالا اور راجہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور تم باٹھ ستم اس سے یہ کہا: "نوٹ جو ان اب دلٹوٹا رکھو اور میرے سر پر۔"

اور یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ باری صاحب اور جن عباس ہفتیوں کے زمانے میں ہیٹ میں کچھ واسطے کے لئے اس پھلوں کی دوکان سے رات کے وقت اکٹری کیے اور سیب چرایا کرتے تھے جس کا دیر انہوں نے ایک کو کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس میں بجلی کا کنکشن نہیں تھا مگر باری صاحب نے جن عباس کو اپنا بجلی گھر بنانے کی ترکیب سمجھا دی تھی۔ چنانچہ وہ ایک زمانے تک سیر نیسٹی کے سارے اپنا کاروبار کر یہ کمرہ روشن کرتے رہے۔

مجھے ایک اور لطیفہ یاد آگیا جو پرانی انارکلی کے اسی کمرے سے متعلق ہے جہاں باری صاحب اور جن عباس اکٹھے رہتے تھے یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں غالباً سات برس کے قیدیمیں سے آیا تھا اس دوران میں معمولی خط و کتابت رہی تھی جن عباس مجھے امرتسر کے اسٹیشن پر مل گیا تھا ان دنوں شرب پر کوئی پابندی

نہیں تھی۔ اسپنسر والے ربرٹ ٹانگہ ڈیول پر اسے عام چپے پھرتے تھے عباس سے  
جڑی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی، چنانچہ اس خوشی میں ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ صبح  
ہی سے شروع کر دینی چاہیے تاکہ جذبات گھٹے گھٹے نہ رہیں جو بات کی جائے کھل کے کی  
جائے یہ فیصلہ ہوتے ہی ہم نے اپنے دل کی چاسیاں جولی داکر کے حوالے کر دیں۔

خیال تھا کہ باری صاحب ایشین پر موجود ہوں گے، مگر قبول حسن عباس، وہ  
حب معمولی ذلیل اللہ ہر نکلے۔ تاہم لے کر ہم نے انہیں اور عمر و دھر تلاش کیا اور آخر  
ڈھونڈ نکلا وہ اس نئے چھپ گئے تھے کہ انہوں نے میری آمد کے ساتھ ہی شراب  
کا سیلاب دیکھ لیا تھا اور بند باندھنے میں مصروف تھے میں نے اور عباس نے انہیں  
بہت لمن طمن کیا اور پہانی صحبتوں کا حوالہ دے کر ان کے عارضی زہد کی خوب بشی پلید  
کی بیتیہ یہ ہوا کہ وہ ایک دم تم کے تم اندھیلے پر آمادہ ہو گئے۔

معلوم نہیں ان دنوں ابو سعید قریشی بی۔ اسے کا تلوہ سر کرنے کے لئے اپنے آخری  
حلقے کی تیاری کر رہا تھا یا اس قلعے کو فتح کرنے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔  
بہر حال وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح مل گیا۔ اس میں اور پرانے سعید قریشی کے باپ  
میں کوئی فرق نہیں تھا اسی طرح وہ اب بھی عمر نیام کی رہا میاں خریدتا تھا اور نہر کے  
کنڈے، چاندنی رات اور گل خزار مشرق کے خواب دیکھتا تھا۔ باری صاحب نے  
تجویز پیش کی کہ اس جرم کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ وہ ایک حدود جونی داکر خریدے  
جرم نے یہ سزا قبول کی اور فوراً بھگت لی۔

پرانی انارکلی کے اس تاریکی کمرے میں ہم سب جمع تھے میں 'باری صاحب  
ابوسعید قریشی، حسن عباس اور عبداللہ ملک درجائے گل زیادہ خوبصورت ہے، تھوڑے  
عرصے کے لئے راجندر سنگھ بیدی بھی آیا۔

باری صاحب حسب توفیق صفائی پسند تھے اپنے میز کی جھاڑ پونچھ اور اس کے  
بناؤ سنگھاریں کافی وقت صرف کرتے تھے لیکن اس معاملے میں وہ بالکل بچوں کے مانند  
تھے۔ ناخن کاٹنے کی چھوٹی سی یقینی ہے۔ وہ بھی اپنے تلمذان کے ساتھ سہاوت  
کے طہر پر دھان رکھ دی ہے، ساتھ ہی شیو کرنے کا سٹرا پڑا ہے کہیں سے گول بٹ  
مل گیا ہے تو اسے آپ نے پیپر ویٹ بنالیا ہے کتابوں کے اوپر کاغذ کے گرد پورش  
چومے ہوئے ہیں ان کے اوپر سوئی دھاگہ رکھا ہے ایک خاق ہے اس میں مختلف  
رسالوں سے کاپی ہونٹ تصویریں جمع ہیں — باری صاحب کو قیسی استعمال کرنے  
کا بہت شوق تھا، معلوم نہیں کیوں ہو سکتا ہے اس لئے کہ وہ اخبار کی کاپی خود ہی  
جوڑا کرتے تھے یہ کام نیوز ایڈیٹروں کے فرائض میں اب بھی داخل ہے لیکن یہ سمجھ  
میں نہیں آتا کہ اخبار کی کاپی جوڑنے سے پہلے ان کو اس اوزار سے کیوں اتنی دغبت تھی  
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امرتسر میں روزنامہ "سداوت" کے دفتر میں وہ انگلیوں میں  
یقینی چنسا کر جب کاپی جوڑنے بیٹھتے تھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی بہت دل پسند  
کام شروع کرنے والے ہیں۔

ان کا میز عام طہر پر دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا اس طرح کہ جب باری صاحب

لکھنے بیٹھیں تو دیوار ان کے سامنے ہو۔ کھتے وقت کوئی روک ان کی آنکھوں کے سامنے ہونی ضروری تھی مجھے یاد ہے ایک بار میں نے گھر میں اپنے میز کا رخ بدل دیا۔ باری صاحب کو کچھ لکھنا تھا کہ وہ پریشان ہوئے تو بے چینی محسوس کرنے لگے میں نے وجہ دریافت کی تو کہا: جب تک میری آنکھوں کے سامنے کوئی روک نہ ہو۔ میں نہیں لکھ سکتا۔ اور یہ کہہ کر وہ لٹرا ٹلس اٹھاٹھا اور اپنے سامنے رکھ لی۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے، لیکن میں مجبور ہوں، پرانی انادکھی کے کمرے سے نکل کر خدا معلوم کہاں جا رہا ہوں۔ لیکن آپ مجھے معاف کر دیجئے جو بات ذہن میں اُبھر رہی ہے، میں اُسی وقت قلم بند کر دیتا ہوں کہ بھول نہ جاؤں ابھی ابھی جب میں نے تصور میں انہیں لکھنے دیکھا تو وہ اپنے دانت بگڑ رہے تھے یہ باری صاحب کی عادت تھی۔ لکھنے کے دوران میں وہ اپنے دانت ضرور کلکتاتے تھے جیسے غصے میں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گول گول حروف لکھتے تھے — اتنے گول کہ بعض اوقات میرے لئے ان کی عبارت کے اکثر لفظ ایک دوسرے کے تلامبہ ہوتے تھے۔

پرانی انادکھی کے اس تاریخی کمرے میں ان کے میز کے ساتھ والی دیوار پر وہ تاریخی گروپ بھی آویزاں تھا جو ہم نے امرتسر میں اتر دیا تھا اس میں عباسی ہے۔ میں ہوں، باری صاحب ہیں، ددا بوسید قریشی ہیں موجود ہے، باری صاحب

لے اس فرٹو کے نیچے شاید "امرت سرا سکول آف تھٹ" لکھا ہوا تھا یہ بادی مرحوم کو بہت عزیز تھا۔ "طاپ" یا پتا پ کے دفتر میں کام کرتے ہوئے اپنا کرٹھ کھڑکی سے نکال کر جب آپ سگرٹھ لینے کے لئے باہر نکلے تھے اور سیدھے براہ راست نیچے تھے تو اپنے ساتھ یہ گروپ بیٹے گئے تھے۔

میں جب اس کمرے میں جو عباس اود بادی صاحب کا گھر تھا، داخل ہوا تو سب سے پہلے بادی صاحب نے مجھے یہ گروپ دکھایا اور اپنے مخصوص انداز میں میں میں بچوں کی تالیاں پٹینے والی خوشی گھول ہوتی تھی، کہا: "خواجہ صاحب یہ دیکھئے۔۔۔ اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سہ کے، لیکن ان کے چہرے کے تمام حدود خال اپنی سیاہ تباہی مار چکے تھے اور سکڑا رہے تھے۔

مرحوم کو مجھ سے بہت محبت تھی ان کو مجھ پر ناز بھی تھا مگر اس کا غلبہ انہوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کیا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی سے اس انداز سے کہا ہو کہ منٹو میرا بچا ہوا ہے، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مجھے تحریروں تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے وہی تھے اگر امرتسر میں ان سے میری ملاقات نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ میں ایک غیر معروف آدمی کی حیثیت میں مرکب گیا ہوتا، یا چھٹی ڈیکٹی کے جرم میں اپنی قید کاٹ رہا ہوتا۔

میں اور عباس بقول بادی صاحب کافی "گٹ تھ" ایک شراب کا دوسرا اتنی طویل مدت کے بعد ملنے کا نشہ ہم سب مجھم رہے تھے۔

ابو سید قریشی کی برق کھول گئی اور وعدہ شروع ہو گئے۔ باری صاحب ہاں کر بہت دلیپ ہو جاتے تھے وہ جگر پڑوں کے جزوان میں لپٹے اور کرسی کے سہائے رحل پر بیٹھے ہمنے کی تصویر پیش کیا کرتے تھے۔ شراب کے پند گھونٹوں کے بعد ایک مختلف شکل اختیار کر لیا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں وہ مزاحیہ اور فرح عنصر جو اکثر شرعی پیغام پہنچے رہتا تھا، بے ریش و بروٹ ہو کر سدھنے آجاتا تھا اس وقت ہی چاہتا تھا کہ وہ برتے ہیں اور ہم سنتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ایسے وقتوں میں کسی اور کو بولنے کا موقع بھی دشوار و نادر ہی دیتے تھے۔

راجندر سنگھ بیدی، اردسی ناول نویس شور و خوف کے "انڈیکریٹ خور دی ڈون" کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ یہ ناول ہم میں سے کسی نے بھی نہیں پڑھا تھا لیکن بیدی کچھ اس انداز سے گفت گو کر رہا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ اس میں شریک ہونا اور یہ ظاہر کرنا پڑا کہ ناول میل پڑھا ہوا ہے جب میں نے اس کا اظہار کیا تو بیدی بکھلا سا گیا باری صاحب تاج گئے کہ معاملہ کیا ہے اور شور و خوف کی ناول نویسی پر ایک ٹکڑا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیدی کو تھوڑی دیر کے بعد بڑے مینڈے پن سے اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ اس نے شور و خوف کا زیر تبصرہ ناول نہیں پڑھا میں نے جس حقیقت کا اظہار کر دیا۔ باری صاحب خوب ہنسنے اور انہوں نے انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں حاضرین کو بتایا کہ شور و خوف کا نام انہوں نے پہلی مرتبہ بیدی صاحب کے منہ سے سنا ہے اور اس کی ناول نویسی پر جبریکہ انہوں نے

پتلایا ہے، ان کی دعاغی اختراع ہے ————— راجندر سنگھ بیدی کو بہت موردِ ملاحظہ تھا اس لئے وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

غالباً دسمبر کے دن تھے۔ سنت سردی تھی۔ میں چونکہ ایک مدت تک باہر رہا تھا اس لئے یہ سردی خاص طور پر مجھے بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ لوہے کی انگلی تھی موجود تھی۔ باری صاحب نے فوراً آگ کا انتظام کر دیا اور ہاڑہ کھول کر باہر گئے اور تھوڑی سی کڑیاں لے آئے۔ ان کو انگلی تھی میں قرینے سے دیکھ کر انہوں نے جونی داکر کی بوتل کھولی اور کچھ چھینے کڑیوں پر مارے پھر ”نڈشت“ ”ڈرٹ“ کہتے ہوئے ان کو باجیں دکھائی جب آگ سنگ اٹھی تو سجدے میں چلے گئے۔

سجدے کا ذکر آیا تو مجھے یاد آگیا کہ وہ بڑے سجدہ گزرتے ایک زمانہ تھا کہ وہ امرتسر میں پانچ کے بجائے کبھی آٹھ بجیں دس وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہ بیٹھک جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے اس کا نام انہوں نے ”دارالاحمر“ رکھا ہوا تھا۔ یہاں جب بھی ان کو نماز ادا کرنے کی حاجت محسوس ہوتی، بی بی جان دھیری والدہ مرحومہ کو آواز دیتے اور بانی کا لڑٹا اور جانماز منگوا لیتے یہ تو ان کے من کی مراد کا قصہ ہے لیکن جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو میں یا عباس اس کو کچر لیتے تو وہ خود اپنے کان اٹھٹھنا شروع کر دیتے تھے۔ اور سہو کئے ایک دو سجدے بڑے خلوص کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

مجھے ایک اپنا سجدہ یاد آگیا جو ابھی تک میرے ماتھے میں بندھ رہا ہے۔



یہ بھی امر تسری کی بات ہے باری صاحب کو میری شراب نوشی پسند نہیں تھی میں سمجھتا تھا کہ وہ بگٹے ہیں ایک شام کو وہ میرے ساتھ تھے سیر کرتے کرتے دیوے اسٹیشن کے دلیفر ٹرینٹ روم میں پہنچ گئے میں نے میرے کو سمجھا دیا کہ وہ میرے لئے دسک لائے اور باری صاحب کے لئے جنمبر میں ایک پیگ جن کا شامل ہو۔

باری صاحب کو کوئی نہ کوئی اور خاص طور پر پیٹ کا عارضہ ضرور لاحق رہتا تھا میں نے ان سے کچھ پیسے کے لئے پوچھا تو کہنے لگے یہ نہیں میں کچھ نہیں ہوں گا۔ میرا مددہ غراب ہے۔

باری صاحب مددی نہیں تھے۔ تھوڑی سی لیکچر بازی کے بعد انہیں کسی بات پر بھی آمادہ کیا جاسکتا تھا چنانچہ میں نے اورک کے فائدے بتائے اور کہا کہ جنمبر کا پانی ان کے معدے کی تمام خرابیاں دور کر دے گا۔ آپ راضی ہو گئے میرے نے ان کے سامنے بوتل گلاس میں اندلی۔ میں نے دسک پینا شروع کر دی اور باری صاحب نے جنمبر جس میں جن اشمال تھی یہ مملول جب ان کے حلق سے اترا تو ان کو فرحت حاصل ہوئی، میں نے اپنی دسکی ختم کر کے جب دوسرا پیگ طلب کیا تو انہوں نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک جنمبر اور پشیں گے۔ میرا اس قسم کا ایک اور مشروب تیار کر کے لے آیا۔

باری صاحب کو بہت لطف آیا مجھ سے کہا کہ اورک کے فائدے میں نے

طلب کی کسی کتاب میں پڑھے تھے۔ واقعی بڑے مسرے کی چیز ہے وہ بوجھ سا وہ الجھن سی جو میں صبح سے عسوس کر رہا تھا، بالکل غائب ہے۔

میں ہنس پڑا۔ اس کے بعد مجھے ان کو بتانا پڑا کہ مسرے کی چیز کون سی تھی وہ بہت خفا ہوئے بلکہ یوں کہنے لگے کہ ان کو بہت دکھ ہوا۔ میری غفلت و حکمت انہوں نے صاف تو کر دی مگر میں عسوس کر رہا تھا کہ انہیں سخت دوا مان کو رفت سرٹ ہے چنانچہ میں نے ان سے صدق دل سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ کبھی شراب نہیں پیوں گا سیراجی لایا تو بادی صاحب نے پنس سے اس پر قبضہ کر لیا یہ مصرعہ لکھ دیا۔

یاد رہے دودن سینہ دل با خبریدہ

بہر پاس واقعے کا بہت اثر ہوا۔ اتنا اثر کہ جب میں سات کو گھر لوٹا تو گلی کے فرش پر میں نے سجدہ کیا اور خدا سے دعا مانگی وہ مجھے اپنے امداد سے میں ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس گناہ کو جو مجھ سے سرزد ہوا ہے معافی کر دے اس سجدے سے طبیعت کا بوجھ تو ہلکا ہو گیا مگر ایک اور بوجھ اس پر لد گیا کہ اب میں پی نہیں سکتا تھا کئی دن گھوم گئے ہر وقت ادا اس چھاٹ رہتی تھی۔ لیکن مل کو پر جانے کے لئے یہ بات موجود تھی کہ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اور ایک لعنت سے بچنے کی کامیاب کوشش کر رہا ہوں۔

ایک دن شام کو بادی صاحب آئے میں کھڑکی میں بیٹھا تھا انہوں نے باہر لگیں میں کھڑے کھڑے میلا مزاج پوچھا میں نے مسکرا کر کہا: کیا پوچھتے ہیں۔

بس ٹھیک ہے !

باری صاحب نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور کہا : ” میں ابھی آتا ہوں !“  
جب وہ آئے تو ان کے پیچھے میں خراب کا آٹھا اڑسا ہوا تھا۔ مجھے سخت حیرت  
ہوئی میں نے ان سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر انہوں نے سننے سے انکار کر دیا۔ اور جاتے  
کھوتا شروع کر دی۔ اتنے میں عباس آگیا۔ باری صاحب کے کہنے پر سب  
ہدازے بند کر دیے گئے۔ اندر سے روٹی منگوائی گئی جو کسی نے بھی نہ کھا  
سایں وغیرہ الگ رکھ لیے گئے۔ اور گلاس چھوڑ کر باقی برتن واپس بھیج دیے  
گئے۔ عباس کنویں سے کوسٹے میں پانی لایا اور ہم سب نے پی — وہ سجدہ  
جو میں نے لکھی کے ٹھنڈے فرش پر اس رات خدا کے حضور ادا کیا تھا میری  
پیشانی میں تڑپتا رہا۔

ہم پی رہے تھے تو حسن عباس نے چھوڑنے کی خاطر باری صاحب سے کہا  
— ” آپ کی بیباں سب عزت کرتے ہیں۔ بی بی جان آپ کو نمازی اور پرہیزگار  
کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ ان کے دل میں آپ کا اتنا احترام ہے — اگر وہ یہاں  
آجائیں تو کیا ہو؟“

باری صاحب نے کہا : ” میں کھڑکی کھول کر باہر کود جاؤں گا۔ اور پھر کبھی واپس  
کو اپنی شکل نہیں دکھائوں گا۔“

باری صاحب ہمیشہ اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھول کر باہر کود جاتے رہے

یہ کھڑکی کھلی رہتی۔ مگر وہ پھر بھی اس کو اپنی شکل دکھاتے۔

کھڑکی کھول کر باہر کو دیکھنے سے کسی تفریق کا تاثر نہیں جڑا۔ اصل میں وہ نظام جو انگریزوں سے متعلق تھا، اور جس میں بادی مروحہ نے انکو ٹھا جو سننے سے حکم کرنا شروع کیا، اور قلم جو سننے سے لے کر اپنا خون چھانٹنے تک کے تمام مراحل انسان و حیوان طے کئے اور اس کے بعد وہ نظام جس میں انہوں نے اقبال مروحہ کی ان تیغوں کے سانسے میں جو ریڈیو پاکستان نے اپنے پروگراموں میں بے نیام کی تھیں، اپنی زندگی کی تمام کے آخری دھندلوں کو سنوارنے کی کوشش کی، ایسی بے شمار کھڑکیوں سے پڑھا تھا، جن کے کھٹکے باہر کو دیکھنے کی جگہ سی خواہش پر بھی خود بخود کھل جاتے تھے۔

پھر دیکھیے، میں کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ بات پرانی اندکھی کے اس کمرے کی بوسہ ہی تھی جہاں دسمبر کی غول بچھ کر دینے والی سردی میں ہم پیسے تھے اور بادی صاحب تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد باہر جاتے اور انگلیٹھی کی آگ برقرار رکھنے کے لئے کہیں سے ایندھن لے آتے تھے۔ بہت دیر کے بعد مٹا ہوا تھا۔ اس لئے وقت گزارنے کا قلعاً احساس نہیں تھا۔ بادی صاحب درخت کی آگیا سرائی کے لئے کتنی مرتبہ ایندھن لائے، یہ بھی یاد نہیں، لیکن ابھی تک بفرار یاد ہے کہ جیب میں صبح کمرے سے باہر نکلا تو بازار کی طرف کھڑکی کا جوشکتہ سا جھگ تھا۔ بالکل غائب تھا۔ اس کی راکھ البتہ کمرے میں انگلیٹھی کے اندر موجود تھی

عباس نے باری صاحب کو دھڑکایا، کہ اگر ایک مکان کو علم ہو گیا کہ وہ جگہ جلا  
 ہلا کر آگ تاپتے رہتے ہیں تو وہ ایک باب ہو جائے گا۔ اور بیک جی دو گوش  
 اُن کو نکال باہر کرے گا۔ باری صاحب جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں بہت عذر پر  
 تھے۔ عباس نے جب ان کو اس غیر واجب حرکت سے آگاہ کیا تو وہ کھسیا نے  
 سے ہو گئے۔ بات کو منہی میں اڑانے کی بھونڈی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے آخر  
 میں عباس سے کہا۔ اہم اُس کو خبر ہونے سے پہلے ہی نکل جائیں گے۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ نکل جانے سے پہلے اُن کے علاوہ ہر ایک کو خبر ہو جاتی  
 تھی۔ وہ جب ٹاپ یا پرتاپ کے دفتر سے کھونٹی سے اپنا کوٹ لٹا کر گرٹ  
 لینے کے لئے باہر نکلے اور برہان پہنچ گئے۔ تو ان کا یہی خیال تھا کہ کسی کو خبر تک  
 نہ ہوگی مگر جاننے والے جانتے تھے کہ وہ کدھر کا رُخ کیئے ہیں۔

باری صاحب نے مختلف چھوٹے بڑے شہروں کی رصدگاہوں میں اپنی قسمت  
 کے ستاروں کا مطالعہ کیا۔ لیکن گھوم پھر کر آخر انہیں لاہور ہی کی رصدگاہ میں آنا  
 پڑا جو کسی زمانے میں عرب ہوش میں تھی۔ اور بعد میں نگینہ سیکری میں اپنے  
 جلد ساز دستان کے ساتھ آئی تھی۔ یہاں اور وہاں بڑے بڑے مہندس  
 اور ستارہ شناس جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ ان کی زندگی میں اپنے ستاروں  
 سے آگے دوسرے جہانوں میں چلے گئے اور کچھ اپنے بے نور ستاروں کے نشے  
 میں دنیاویوں کی چمک دمک بھیک کے طور پر رہتے رہے۔

باری صاحب کو جب کبھی میں نے ان محفلوں میں دیکھا، مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ گرم گرم کالی کوئی کاپیلا ہیں جس میں سے بھاپ کا دھواں اٹھ رہا ہے جو صرف چند لمحوں کے لئے فضا میں بہرانا، بل کھاتا ہے اور پھر اس کی نمی کی آغوش میں سو جاتا ہے۔ ان محفلوں میں، ان کشتی، گرم دوسرے جہتوں میں ان کے دفنی سر کی ہڈیاں سے طرح طرح کے ذہنی ماکولات کی خوشبودار بھاپ اٹھتی ہے، گھرانے، بھوکوں اور بیکریوں کی کثیف فضا میں تھوڑی دیر اپنی نزاکت اور ندرت پر اترتا اترتا کر دیں سر جاتی۔

باری صاحب! باتوں کے بارشاد تھے۔ کوچہ و کیلاں کے دارالاحمر میں جب وہ ولی اللہ (گاجیکے) کو وہ ولی اللہ کہا کرتے تھے، اکا سہارا لے کر بیٹھتے تو دلچسپ باتوں کے دیا بسنے شروع ہو جاتے تھے۔ اُن دنوں سرور صاحب (آفاق کے مُبیر) بھی کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ آپ میری حرکات و سکنات میں گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ باری صاحب کی طرح وہ بھی میری حوصلہ افزائی فرمایا کرتے اور باتوں باتوں میں بے یقین دلاتے تھے کہ میں بہت جلد تحریر و تصنیف کے قابل ہو جاؤں گا۔

اسرئسرا ذکر آیا تو مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا۔ میں، باری صاحب، حسن عباس اور ابوسعید قریشی اپنی محفل میں کسی اور کی شمولیت پسند نہیں کرتے تھے کامرٹ

## باری صاحب

فیروز الدین منصور سے ہم سب کی صاحب سلامت تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی دارالاحقر شریفی لے آتے تھے، مگر ان کی تشریف آوری ہم سب کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ باری صاحب انرا وہ مذاق کہا کرتے تھے کہ کامریٹ صاحب پڑاشیم پیگنٹ سے ہم بناتے ہیں عباس الحوذر الدین منصور کہتے تھے کچھ دیر ہم ان کا آنا جانا برداشت کرتے رہے، آخر باری صاحب کو ایک ترکیب سوجھی کہ امرئی ایف ڈی منصور کمرے میں داخل ہوئے تو باری صاحب نے خستے بھونٹے طریقے سے آنکھ مار کر عباس سے کہا ”خواجہ صاحب — چلے پھر کہیں دیر نہ ہو جائے“ اوروں کو کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دیں۔ منصور صاحب جو بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے، ہمارے ساتھ چل پڑے بازار میں نکل کر باری صاحب نے ان سے معذرت طلب کی اور ہم ایک چکر کاٹ کر پھر دارالاحقر واپس آ گئے۔ باری صاحب بہت خوش تھے۔ اتنے خوش کہ وہ دیر تک ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے رہے۔

باری صاحب بہت معمولی معمولی باتوں پر غرض ہو جایا کرتے تھے ان کی خوشی جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں، بالکل بچوں کی سی خوشی ہوتی تھی۔ اس میں تاہیاں پیچھے کا شور ہوتا تھا۔ ان کی توند بڑھی ہوئی تھی۔ جس کے متعلق وہ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے اجب وہ ہنستے تھے تو یہ بھی ہنسا کرتی تھی۔

بہت غصے آدمی تھے، اتنے غصے کہ انہوں نے اپنی آنے والی موت سے بھی کوئی ڈرائی جگہ نہ کیا۔ اصل میں وہ لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔

اُن کی طبیعت صلیح کُن تھی۔ دل کا عارِقد ان کو بہت دیر سے تھا۔ مگر اس کا علاج انہوں نے جب بھی کیا۔ مصالحت اُمیرِ طریقے سے کیا۔ اس کی مدافعت میں ان سے کبھی جارحانہ قدم نہ اٹھا۔

مجھے یاد ہے۔ مرنے سے دو روز پہلے میری ان سے ٹھیکڑیو سولڈیئر ہوئی۔ بروٹھرا لے چوک سے دائیں ہاتھ کو ان کا تانگہ جارہا تھا۔ مجھے دیکھا تو اسے رکوا دیا۔ میں ان سے ناراض تھا۔ سخت ناراض تھا۔ اس لئے کہ وہ دُور دُور رہتے تھے۔ انگریزوں کے اپنی کشتی کے دفتر میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہ کچھ ایسے مجھ گئے کہ اپنے بے تکلف دوستوں سے اگر ان کی ملاقات محض اتفاقیہ طور پر ہو جاتی، تو عجیب و غریب سا عجب محسوس کرتے۔

میں اُن کے پاس پہنچا تو وہ تانگے سے اترے۔ عجب سے مصافقہ کیا۔ اور میری خیریت دریافت کی۔ یہ رسوم مجھے بہت بُری معلوم ہوئیں۔ میں نے اُن سے کہا — باری صاحب آپ بہت ذلیل ہو گئے ہیں۔ اتنے ذلیل کہ آپ نے عجب سے متاجنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے انگریز کی نوکری کیا کی ہے، اپنا سالا کیرکٹر تباہ کر دیا ہے۔

میری معن معن کے جواب میں گٹھی گٹھی، بیدار بیدار سی مسکرائیں۔ ان کے ادوسے ہونٹوں پر بھرتی رہیں۔ ان کے چہرے کا رنگ کسی قدر درودِ خدا اور اطمینانِ حق میں نے اُن سے پوچھا: خیر چھوڑ دیا ہے اس قحط کو، یہ تباہی آپ کا مزاج کیسا ہے



میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے ٹہری سنجیدگی سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ ایک مرحلے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہیں ہسپتالوں میں علاج کر چکے ہیں مگر کوئی افادہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ میروڈ پر کوئی جوش پختہ ہے، اب وہ اس سے رجوع کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے اتفاق مذاق کیا۔ یہ دیکھ کر وہ باتیں رہ گئی تھیں، جہاں آپ اپنے تئیں تاروں کا مطالعہ کرتے جا رہے ہیں۔ چھوڑیے باری صاحب، آپ کو کوئی عارضہ وارفتہ نہیں، آپ کو صرف وہم کی بیماری ہے، جس کا علاج اساتذہ حکیم کے پاس بھی نہیں تھا۔ آپ زیادہ کھاتے ہیں، اس لئے آپ کا معدہ خراب رہتا ہے۔ بخیر کے باعث جو بیماریاں اٹھتی ہیں آپ کے دل پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے جسے آپ نے ہنگامہ بنا رکھا ہے!

میری بات ان کے دل کو لگی۔ (ان کے دل کو ہر بات لگ جاتی تھی) کہنے لگے! میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہتے ہیں، بخیر کی شکایت تو مجھے ہے..... اور بس ڈاکٹروں کی تشنیعیں یہی کہتی ہے؟

بہت دیر تک میری ان کی باتیں، سُنیں مجھے انہوں نے بتایا کہ وہ تاریخ عالم (کئی جلدوں میں ایک مبسوط کتاب جو مرحوم محلّہ ذکر سکے) دوبارہ چھپا کر لکھ رہے ہیں اور ترکی زبان میں پنجابی الفاظ تلاش کر رہے ہیں۔

مرحوم کو پنجابی زبان سے بہت محبت تھی، ایک زمانہ تھا کہ وہ پنجابی کو پنجاب

کی قومی زبان جاننے پر نئے ہوئے تھے۔ اُن دنوں وہ غالباً سکھوں کے انبار اجیت کے ڈاکٹر تھے جہاں بیٹھے تھے اپنی نئی اسکیوں کا ذکر چھیڑتے تھے۔ جن کے ذریعے سے وہ اردو کے بجائے پنجابی داغ کرنا چاہتے تھے، بہرٹنے والے کو تعلقین کہتے کہ اردو کی بجائے اپنی مادری زبان پنجابی میں لکھا کیسے۔ ان کا کہنا تھا کہ صرف وہی زبان جاندار ہوتی ہے۔ جس میں دی ہوئی گالی وزن دار ہو اور انفرادیت در رکھتی ہو۔ ان کا ایمان تھا کہ دنیا کی کوئی زبان گالیوں کے معاملے میں پنجابی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے اور پُر لطف بات یہ ہے کہ خود باری صاحب نے اپنی زندگی میں ایک سطر میں پنجابی زبان میں دیکھی۔

تقسیم سے پہلے انارکلی میں ایک کیلاش ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس میں بار بھی تھی خدمات کے سلسلے میں جب لاہور آنا تو چودہری تھیر کے ساتھ اس ہوٹل میں دو تین مجلس ضرور جیتی تھیں۔ جن میں باری صاحب کو شریک ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ہم بالائی منزل پر پہلے جاتے اور وہاں کے دو شروع ہو جاتے۔ ایک سکھ بھرا تھا۔ باری صاحب جب دو پیگ پی لیتے تو اس سے ٹیٹ پنجابی میں گفتگو شروع کر دیتے۔ اس وقت ان کے دل دماغ میں صرف پنجابی زبان کی ترمیم کا خیال تھا لیکن چار پیگ کے بعد وہ کانٹا بدل کر اردو کی طرف آ جاتے اور اس کی عالمگیری کے تسلی تقریر شروع کر دیتے اور کہتے کہ پنجابی غنہ دں اور لغتگوں کی زبان ہے، بہت غیر مبذب ہے۔ جو سماعت پر گراں گذرتی ہے۔ پانچویں اور چھٹے

پگ کے دوران میں اُردو سے اُن کی وابہانہ محبت سکڑتی رہتی جب ہانچوں پگ اپنا کام کر جاتا تو وہ فارسی کی مٹھاس کے گردیدہ نظر آتے ٹیٹا اِرائی ہیے میں خادس بوسنے کی گردش کر تے مگر چٹا اور ساتراں پگ انہیں پشت کے چوروں میں لڑمکانا شروع کر دیتا۔ آخوئیں اور نوں پگ میں پنجابی، اُردو، فارسی پشتو اور عربی اُن کے داغ میں اکاکھیل دین کر چھپنے لگتی ۔

مروم بوسنے اور اپنی آواز آپ سننے کے بہت شائق تھے۔ اتنی جمت نہیں تھی کہ کسی جلسے میں تقریر کرتے، لیکن بار دوستوں کی محفل میں اپنا شوق پورا کر سیا کرتے تھے۔ دہلی مسلم ہوٹل میں سے ایک دفع آپ ایک چمچ اڑا لائے، آدمی رات کا وقت تھا، جب ہم انا رگی کے وسط میں پہنچے تو آپ نے یہ چمچ نکال کر پیلے کے ہاند اپنے کاندھے پر رکھ دیا اور چپ راست، چپ راست، کرتے ایک دکان کے قریے پر چڑھ گئے۔ اور خاک روں کی تحریک پر ایک عدد تقریر اُگل کے رکھ دی۔ بے شمار آدمی جمع ہو گئے۔ لیکن باری صاحب جوش و خروش کے ساتھ بولتے رہے۔ اس کے بعد ہم سب نے چوک میں گھرے ہو کر علامہ مشرق زندہ باد کے نعرے لگائے پھر مرتجے کے بار خیز سے اور اپنے اپنے گے میں ڈال دیے۔ باری صاحب نے ایک بار اپنی کلائی کے گرد پیٹ یا اور بھروسے کہا۔ "عواہر صاحب، چلو میرا خندہ چلیں" سہ مرتبے کے ان پھوٹوں کی خوشبو کا رُخ اُسی طرف ہے ۔

ہم سب میرا خندہ چلیے۔ باری صاحب کے سراد خوب گھٹے ہوئے تھے بہت

دیر تک ہم اس منڈی کی تنگ ذرا گلیوں میں گھومتے رہے اس دوران میں باری صاحب نے کئی چٹان ٹکیا یوں سے پشتوں میں بات چیت کی۔ ایک ایسی ٹکیائی سے صرف غفلت گتھے کہ ان کی جان بچان کا ایک آدمی اُدھر سے گزرا۔ باری صاحب نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اُنھں آدمی نے پوچھا۔ ”مولانا یہاں کیا ہو رہے ہیں؟“

باری صاحب نے چٹان کسی کی طرف دیکھا اور جواب دیا: ”اس ٹرکی سے سیاستِ حاضرہ پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔“

صبح عباس نے باری صاحب کو رات کے تمام واقعات سنائے خوب مریج لگا کہ اس انداز میں کہ وہ مذمتِ محسوس کریں۔ باری صاحب نے ٹھہرے سے تصدیق چاہی تو میں نے معنوی تنبیہ کی سے کہا: ”باری صاحب، یہ واقع ہے کہ آپ نے کل رات بڑی ذلیل حرکتیں کیں۔ یہ آپ کی شایانِ شان نہیں تھیں؟“

باری صاحب بہت نادام ہوئے۔ اس قدر نادام کہ آپ نے فوراً وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی۔

باری صاحب کو صلیب بننے کا شوق تھا، ان کی ہلی آرزو تھی کہ وہ ایک بہت بڑے رہ نمائین بنائیں۔ ہر چوک میں ان کا بٹن نصب ہو۔ وہ کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیں کہ اُنہں نے والی تمام نیسیں انہیں یاد رکھیں۔ مگر اس کے لئے جرات اور جسے باکی کی ضرورت تھی۔ اُنھی قسم کی جرات اور بے باکی جس کا مظاہرہ وہ کبھی کبھی اپنی کمرہ سیرا منڈی کی گلیوں میں چٹان ٹکیائیوں سے سیاستِ حاضرہ پر تبادلہ خیالات

کے دوران میں کیا کرتے تھے۔ لیکن جب کہیں ان سے ایسی جملات اور بے باکی سرزد ہو جاتی تو وہ دھڑک کر کے غائب ہونا شروع کر دیتے اور اس کی آفائشوں سے خود کو پاک صاف کر لیتے۔

وہ قہقہے کو انگلیوں میں پھنسا کر اپنے خیالات و افکار کے زرد زرد کتابت شدہ کاغذوں کو کاٹ کاٹ کر ساری عمر اپنی زندگی کی کوئی جوڑتے رہے مگر اسے پتروں پر کبھی مستقل ذکر کئے۔ شاید اس خیال سے کہ وہ ان کے ہوجھتے پس جائیں گے۔ ان کو ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کے پس جانے کا خدشہ لاحق رہتا تھا حالانکہ وہ تمام کرپس کر سفوف بنا دینا چاہتے تھے اور اس سفوف کو نوار کے طور پر استعمال کرنے کے خواہشمند تھے۔

وہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ لیکن یہ طرز تا شاہ ہے کہ جب انگریز چلا گیا تو وہ اُسی کے نوکر ہو گئے۔ انہوں نے اپنی کی حکومت جیسی باغیاد کتاب لکھی لیکن اس لکھنے کے سابق ٹھیکہ داروں کی ملازمت میں انہوں نے اپنی زندگی کے چند آخری اور بڑے قیمتی برس گزارے۔

باری مرحوم سے میں اپنی آخری ملاقات کا ذکر کر رہا تھا جب وہ کسی ہوسیع پتہ سے اپنے دل کے مارنے کا علاج پوچھنے جا رہے تھے۔ اس دل کا بخڑا صوف سے معمور تھا۔ جو اس قدر شریف تھا کہ اس نے باری صاحب کی بزدلی کا ساتھ دیا اور دھڑکنا بند کر دیا۔

میں نے انہی دنوں میں آغا حشر کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا (جو اس کتاب میں شامل ہے) اس میں مجھے کے بھول میں باری صاحب سے پہلی بد ملاقات کرنے کا ذکر بھی تھا باری صاحب نے یہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا تھا جس میں امرتسر کے اُن ایتام کی یاد تازہ کی تھی جب میں ابوسعید، عباس، عاشق، فخر، گرانتر اور باری صاحب مل کر بالکل عجیبوں کی طرح بازاروں میں گھومنا کرتے تھے۔

یہ مطلب بے مقصد۔۔۔ جب ہم نے 'فری ٹھنکرہ' جیسی آرٹسٹ ٹپانگ جماعت کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے قواعد و ضوابط میں نمبر ایک پر یہ چیز تھی کہ فری ٹھنکرہ جو بھی چاہے کرے کسی کو اس کا استحقاق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اُس سے اس کے کسی فعل کے متعلق استفسار کرے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ہم چاروں جا رہے ہیں کہ اچانک باری صاحب موڑ مشرے اور ہم سے جدا ہو گئے، بڑی گرم باتیں ہو رہی ہیں کہ اچانک عباس خاموش ہو گیا اور واپس چلا گیا۔

اس خط کے بارے میں باری صاحب سے مختصر سی گفتگو ہوئی۔ میں نے باری صاحب سے کہا کہ یوں تو انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کا حافظہ بہت تیز ہے لیکن وہ ان ایتام کی بہت سی باتوں کا تذکرہ بھول گئے ہیں۔ باری صاحب نے خیف آوازیں سنندت چاہی اور کہا کہ انہوں نے یہ خط بڑی رواداری میں لکھا ہے۔ حکایت بہت دلنزدہ تھی، لیکن انہیں سکون طلب تیسر نہیں تھا۔

انہوں نے سکون طلب کا ذکر کیا تو میں پھر ان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ کیوں اپنے

قلب کے پیچھے چڑے ہوئے ہیں جو اچھا بھلا ہے۔ لیکن میسرے رند میچ چھٹکے چادر کی پہلی پیالی پی کر میں نے سگریٹ سلگایا اور تازہ امروز کھولا تو پہلے صفحے پر یہ سُرخی نظر آئی کہ اشتراکی ادیب باری کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصے کے لئے میں بالکل گم گم ہو گیا۔ میں نے پھر خبر کی طرف دیکھا۔ یہی کامی سُرخی تھی۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ کوئی جوڑتے وقت یہ سُرخی باری صاحب نے قہقی سے کاٹ کر خود اپنے ہاتھوں سے بڑے قریب کے ساتھ چائی ہے۔

اشتراکی ادیب باری، میرا دوست، میرا رہ نما، تمام اپنی زندگی کی جلی اور خفی سرخیاں جاتا رہا۔ لیکن افسوس کہ وہ اُن کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکا۔ جو اس کے ذہنی سر میں پروش پاتے تھے۔ اور بجاپ ہی کر لاء کی بیگریوں اور ہوشوں کی کثیف فضا میں جذب ہو جاتے تھے۔

باری صاحب قبر میں ہیں، معلوم نہیں اس میں بھی کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے وہ کوہِ کربلا پہنچ سکیں۔

## عصمت چغتائی

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدرآباد سے ایک صاحب کا ڈاک کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا ۔  
 "یہ کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی ؟ منٹو اور عصمت  
 اگر یہ دوستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر انفرس کہ عصمت نے شاہ  
 سے شادی کر لی اور منٹو۔۔۔۔۔"

انہی دنوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی  
 اس میں شدیدک نہیں تھا۔ لیکن حیدرآباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی،  
 جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھبر کر یہ سوال کیا ۔  
 آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی ؟



مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط لیکن جب عصمت چنائی داپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدر آباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے سوال کیا: کیا منٹو کنوؤرا ہے؟ تو اس نے ذرا طنز کے ساتھ جواب دیا: بی نہیں! اس پر وہ مختصر عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسائی سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

واقعات کچھ یہیں ہوں، لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ سولے ہندوستان میں ایک صرف حیدر آباد ہی ایسی جگہ ہے، جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکر مند رہے ہیں :

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں اگر میں اور عصمت واقعی سیماں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ یہ اگر بھی کچھ اسی قسم کی اگہ ہے، اگر کہا جائے کہ اگر تلونڈی والی ناک ایک اونچے کا اٹھا دھواں معدہ چری ہوتی تو اس کا اثر وادی نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا۔ لیکن یہاں عصمت تلونڈی والی ہے اور منٹو اعلیٰ، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر ہندو حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایسی حیثیت رکھتا، افسانے افسانے بن جاتے کہائیاں حضرت کرپیلیاں ہو جاتیں۔ انشاء کی چاتوڑی میں سارا دودھ خشک ہو کر باقی تو ایک صوف کی شکل اختیار کر لیتا یا جسم ہو کر داکہ بن جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری تحریر ہوتے لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرین قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

کرناج اسے پردوں انسانے نکلتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے  
تاکہ سند رہے۔ نجاج کے دوران میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

”صحت قاضی صاحب کی پیشانی ایسا گنتہ تختی ہے۔“

”کیا کہا؟“

”تہاڑے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟“

”میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا۔“ تہاڑی اپنی آواز صحت سے باہر

نہیں نکلتی۔“

”بعد ہو گئی ہے۔“ — لاپ سنو۔ میں یہ کہہ رہا تھا قاضی صاحب کی

پیشانی بالکل تختی سے متی جتنی ہے؟“

”تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے۔“

”یہ پیشانی سپاٹ نہیں؟“

”تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟“

”جی نہیں۔“

”سپاٹ اتنا تہاڑا ہے۔“ قاضی جی کا ہاتھ تو۔۔۔۔۔“

”خوار و غمبورت ہے۔“

”خوار و غمبورت تو ہے۔“

”تم محض چڑا رہی ہو مجھے۔“

”چڑا تم ہے ہو مجھے۔“

”میں کہتا ہوں تم چڑا ہی ہو مجھے۔“

”میں کہتی ہوں تم چڑا ہے ہو مجھے۔“

”تو میں اتنا چڑے گا کہ تم چڑا ہی ہو مجھے۔“

”اچی واہ — تم تو ابھی سے شر میں بیٹھے۔“

”قانعی صاحب! میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا۔ اگر آپ

کی بیٹی کا اقا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھا دیجئے۔“

”قانعی صاحب! میں اس مرد سے شادی نہیں کروں گی۔۔۔ اگر آپ کی

جاد بھریاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجئے۔ مجھے آپ کا اقا بہت پسند ہے۔“

”گرجن چندر! جو تمہیں کے دریا چے میں مکتا ہے۔“

”سمت کو چپائے میں، پڑھنے والے کو حیرت۔“

اضطراب میں غم کو دینے میں اللہ پھر لیا ایک آغوش

اس اضطراب و حیرت کو مسرت میں تبدیل کر دینے

کی صفت میں عصمت اور مٹو ایک دوسرے کے

بہت قریب ہیں اللہ اس فن میں ارگود کے بہت

کم اصناف نگار ان کے حریف ہیں۔“

اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دردِ مردوں کو حیرت و اضطراب میں غم

کرنے کے بجائے ہم خود اس میں غرق ہو جاتے۔ اور جب ایک دم چونکے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ مسرت کے بجائے ایک بہت بڑے دکاہیہ میں تبدیل ہو جاتا۔ — صحت اور خوشنکاح اور شادی کتنی مضحکہ خیز چیز ہے۔  
 صحت کھتی ہے۔

ایک فدا ساسی محبت کی دنیا میں کتنے شرکت کتنے نمود عباس  
 عسکری یونس لادہ جانے کون کون تماش کی گڈی کی طرح  
 پھینٹ کر کھیر دیے گئے ہیں۔ کوئی تباہ۔ ان میں سے چوتھا  
 کون سا ہے؟ — شرکت کی بھوک بھوک کہاں سے لہرے  
 انگلیں نمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضاء  
 عسکری کسبے دم ہاتھ یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہی  
 عباس کی کھوئی ہوئی سکواٹش اور ہزاروں چمڑے پتکے  
 سینے کشادہ پیشانیاں گھنے گھنے ہاں اسٹارل پنڈلیاں  
 مضبوط بازو۔ سب ایک ساتھ مل کر پتے سوت کے ڈونڈوں  
 کی طرح اُچھ کر رہ گئے ہیں۔ ہڈیاں ہو جو کراس ڈیسر کو  
 دیکھتی ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا مریکڑا کیسیوں  
 کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہاگے دُردِ اُفتق

سے بھی اور پر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں ۔

(چھوٹی کہاں)

غور مختصر ہے ۔

میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور نہیں  
 خریدنا قبائے لئے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے  
 کے بجائے ایک درد بیگے زمین خرید لو اور اس پر ساری  
 قربانیاں رہو۔ زندگی میں صرف ایک عورت — اور  
 یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے؟ — کیوں اس میں تنہا  
 قلشے بج رہی ہیں؟ — صرف گندم پیدا کر کے ہی اللہ میاں نے  
 اپنا اتھ کیوں دروگ لیا — میری خواہش اس زندگی کو جو کہ  
 تمہیں دی گئی ہے اسی طرح استعمال کرو۔ تم ایسے گامک  
 ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سربا بہتے کہتے  
 رہو گے مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔ میں ایسا خریدار ہوں جو  
 زندگی میں کئی عورتوں سے سوہنے کہے گا۔ تم ایسا عشق  
 کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی پر کوئی اور فی دہے کا مصنف  
 ایک کتاب لکھے جسے خلائق دت سہلگی پیسے کا قندوں پر چھاپے  
 اور ڈبلی بانار میں اسے دھکی کے بھاڑ بیچے۔ میں اپنی

کتاب حیات کے تمام اوراق دیکھ لیں کہ چٹ جانا چاہتا ہوں  
 تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ تم نیت میں زندگی چاہتے ہو  
 زندگی میں محبت چاہتا ہوں؟ (تکلیف)

صحت کو اگر اچھے برے وقت کے ڈیسر میں سے ایسا سرا مل جاتا۔ کھینچنے پر جو  
 کھینچتا ہی چلا آتا اور وہ اس کے سہارے دھند افق سے اوپر ایک تپک کی طرح  
 قی جاتی اور غمڑا اگر اپنی کتاب حیات کے آدھ اوراق میں دیکھ لیں کہ چاہتے  
 ہیں کہ سیاب ہو جاتا تو آج ادب کی طرح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے  
 کبھی نہ ہوتے۔ وہ دھند افق سے بھی اُپر، ہوائیں تنی رہتی اور غمڑا کے پیٹ میں  
 اس کی کتاب حیات کے باقی اوراق بکس ہر کے اس کے ہمدردا سے شیشے  
 کی اندری میں بند کر دیتے۔

’پڑھیں کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے۔

صحت کا نام آتے ہی مردانہ نگاہوں کو دھسے پڑنے  
 لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں، آپ ہی آپ خفیف ہوتے  
 جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ میں اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے  
 صحت کے متعلق جو کہ میں کھرا ہوں، کسی بھی قسم کی خفت مٹانے کا نتیجہ نہیں  
 ایک قرعہ تھا جو سود کی بہت ہی جلی خراج کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔  
 سب سے پہلے میں نے صحت کو کون سا انسان چڑھاتا، مجھے بالکل یاد نہیں

## بچے فرشتے

یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے حافظے کو بہت کھڑچا۔ لیکن اس نے میری رہبری نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں صحت کے افسانے کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دوزخ نہیں پڑا۔ لیکن جیب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت نا اُمید ہی ہوئی۔

اڈالٹی چیزیں زکیر روڈ میٹ کے، انفریڈیٹ میں جہاں ’مصور ہفت وار‘ کا دفتر تھا۔ شاہد لطیف اپنی درس کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ اگست ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ تمام کانگریسی لیڈر دھاتا گا گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی۔ فضا سیاست میں بسی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ دیر گفتگو کا موضوع تحریک آزادی روڈ۔ اس کے بعد رنج بدلا اور افسانوں کی باتیں شروع کر دیں۔

ایک ہفتہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا ادب لطیف میں ’صحت کا لحاظ‘ شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے۔ میں نے کوشش چند سے کہا تھا۔ افسانہ بہت اچھا ہے۔ لیکن آخری جملہ بہت غیر معائنہ ہے احمد ندیم کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔ چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے صحت سے کہا: ”آپ کا افسانہ لحاظ مجھے بہت پسند آیا۔ یہ بیان میں افسانہ کو بقدر کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار سا جملہ لکھ دیا کہ ایک رات آٹھ بجے ہونے لگا۔ میں نے کیا دیکھا۔ کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو میں کبھی

نہیں بتاؤں گی :

صحت نے کہا : کیا عیب ہے اس مجھے ہیں ؟

میں جواب میں کچھ کہنے ہی دلاتا تھا کہ مجھے صحت کے چہرے پر وہی مٹا ہوا  
جھاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شے کا نام سنی کر نمودار ہو سکتا  
ہے مجھے صحت ناامیدی ہوئی اس لئے کہ میں 'محاف' کے تمام جزئیات کے متعلق اس  
سے بآئیں کرنا چاہتا تھا جب صحت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا : یہ تو کم بخت  
بالکل عورت نکلی ۔

مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بری کو دہلی خط  
لکھا : 'صحت سے ملا ، تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے  
جیسی تم ہو ۔ میرا مزاج بالکل کرکڑا ہو گیا ۔ لیکن تم اسے یقیناً پسند کر لو گی ۔ میں نے  
جب اس سے ایک اپنچ اٹھے ہوئے محاف کا ذکر کیا تو نالائق اس کا تصور کرتے  
ہی جھپٹ گئی !

ایک مریض کے بعد میں نے اپنے اس پہلے دور عمل پر تنقید کی سے خود کیا  
اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اپنے فن کی بقا کے لئے انسان کو اپنی فطرت  
کی حدود میں رہنا اڑسیں لازم ہے ۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے ؟ کچھ تو  
گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور کچھ پتلون کی جیبوں میں شس ہو کر رہ گیا ۔  
فرانس میں جارج سان نے سوانیت کا حسین طبع آباد کر کے تصنع کی زندگی اختیار کی پاکستانی



میں تار و خنجر سے ہو چکوا تھکوا کر اس نے مل و گہر ضرور پیدا کرائے۔ لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بلن میں دم گھٹ کے مر گیا۔

میں نے سوچا عورت جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑے پہاڑ کاٹے۔ انسان نگاری کہتے کرتے عصمت چٹائی بن جائے۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی ہندی بچنی ہی چاہیے۔ اس کی ہاتھوں سے چوڑی کی کھنک آتی ہی چلبیٹے مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا۔ یہ تو کم بخت بالکل عورت تھی؟

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے ثبوتوں میں بھول جلیاں اتل، بھاف اور گیندا جیسے نازک اور لالہ افسانے کبھی بھی نظر آتے یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تعصب سے پاک۔ یہ ادائیں وہ مشورے، وہ نمز سے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کیجے پھلنی کیے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان ادائوں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزل مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی ان باتیں — ان برعہ مگر غلیس فطرت بے بیل گیر ہو جاتے ہیں۔

ان کی رنگت بدلی: پیارا بچہ — مر گیا اس کا باپ شاید:  
خداک تمہارے سن میں، خدا نہ کہے۔ میں نے ننھے کر کیلچے سے لگا لیا۔  
”ٹھائیں۔“ ننھے نے مرقہ پا کر بندوق چلائی۔

”اتیں پامی — آبا کو اتنا ہے: میں نے بندوق چھین لی۔ (بھول جلیاں)

اور لوگ کہتے ہیں صمت ناشدنی ہے، چڑیل ہے — گدھے کہیں گے ان چار سطروں میں صمت نے صورت کی روح نہ بڑھ کر رکھ دی ہے اور یہ لوگ اسے اخلاق کی انتہائی ظہیروں میں بیٹھے بلا کر دیکھ رہے ہیں، تو پدم کر دینا چاہیئے ایسی اوندھی کھوپڑیوں کو۔

دستی 'میں' دوزخی، چپا۔ میری بہن نے چڑھا اور مجھے سے کہا: 'صامت اب یہ صمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے موٹے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے کسی کسی فضول باتیں کہیں ہیں؟'

میں نے کہا: 'اقبال اگر میری سوت پر تم ایسا ہی صنوں لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لئے تیار ہوں؟'

شاہجہان نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ اس نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں 'دوزخی' لکھا۔ شاہجہان نے دوسروں سے چھڑاٹھوائے انہیں ترشٹوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی، صمت نے خود اپنے 'دستوں' سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک اور پنچا پان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نقش رکھ دی۔ تاج شاہجہان کی محبت کا برہمن سرری اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن 'دوزخی' صمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے وہ جنت جہاں مضمون میں آیا ہے، عنوان اس کا اختیار نہیں دیتا۔

پہلی بیوی نے یہ مضمون چڑھا تو صمت سے کہا: 'تم نے کیا خرافات لکھی ہیں؟'

’بکونہیں — لازوہ برت کہاں ہے !‘

صحت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے بالکل بچوں کی طرح ٹولی ہاتھ میں لیے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹی رہتی ہے۔ اس نے اپنے معین انسانے بھی برف کھا کھا کر رکھے ہیں۔ چارپائی پر بکینیوں کے بل اور دھمی بیٹی ہے۔ ساتے بیگے پر کاپی لکھی ہے ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پن ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ٹولی ریڈیو اپنے سروں میں پٹا رہا ہے عکراس کا تلم اور منہ دونوں کٹا کٹ پل رہے ہیں۔ صحت پر کھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ دیکھے تو مہنوں گزر جاتے ہیں۔ پر جب دیرہ پڑے تو سینکڑوں صفے اس کے قلم کے ٹپے سے نکل جاتے ہیں۔ کھانے پینے، نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ بس ہر وقت چارپائی پر بکینیوں کے بل اور دھمی بیٹی اپنے میٹرھے میٹرھے اعصاب اور اٹلا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔

’میٹرھی کی جیسا طول طویل ناول میرا خیال ہے صحت نے سات آٹھ نشستوں میں ختم کیا تھا۔‘

کرشن چندر صحت کے بیان کی رفتار کے متعلق کہتا ہے۔

’انسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات بوندہیں میں آتی ہے

وہ ہے گھوڑ دوڑ یعنی رفتار، حرکت، سبک خوامی (میرا

خیال ہے اس سے کرشن چندر کی مراد برق رفتاری تھی) اور

تیز گرمی۔ نہ صرف افسانہ دور تا ہمارا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے  
کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور  
احساسات ایک طوفان کی سی بلاغی فزنی کے ساتھ چلتے اور  
آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔

صحت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ کھٹا شروع کرے گی  
تو کئی مرتبہ اس کا داغ آگے نکل جائے گا اور حافظہ بہت پیچھے ہٹے رہ جائیں  
گے۔ باتیں کہے گی تو لفظ ایک دوسرے پر پڑتے جائیں گے۔ سبب بھی بگڑنے  
کی خاطر اگر کبھی بارہی خانے میں چلی جائے گی۔ تو مہلکہ بالکل چوڑی ہو  
جائے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت ہی جبلت ہے اس لیے آٹے کا پڑا بناتے  
ہی سسکی سنکائی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آٹا ابھی پھیلتے نہیں  
گئے لیکن ان کا سالن اس کے داغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے اور میرا  
خیال ہے۔ بہمن اوقات وہ بارہی خانے میں قدم رکھ کر ضیال خیال میں  
شکم سیر ہو کر وٹ آتی ہوگی۔ لیکن اس حد سے بڑھی ہوئی جبلت کے  
مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ جاتی جاتی  
کے فراق سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم کہتے وقت ابلا کی عطلیاں کر جاتا ہے لیکن  
نہی کے فراق سیتے وقت اس کی سوتی سے ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوتی۔ چنے  
تٹے ٹانکے ہوتے ہیں اور محال ہے جو کہیں معمول ہو۔

’اُف سے بچتے‘ میں عصمت لکھتی ہے ۔

’گھر کیا ہے محلے کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے دبا آئے۔ دُنیا  
کے نیچے پٹا پٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی شس  
سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ گھر ہسپتال بن  
جاتا ہے — سختے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں  
موتے ہوں گے۔ کیا خبر؟‘

اور پچھلے دنوں بمبئی میں۔ جب اس کی پہلی بیٹا کو کالی کھانسی ہوئی تو وہ راتیں  
جاگتی تھی، ہر وقت کھوٹی کھوٹی رہتی تھی۔ ماماں بننے کے ساتھ ہی کوکھ سے  
باہر نکلتی ہے ۔

عصمت پر لے رہے کی ہٹ دھرم ہے ۔ طبیعت میں ضد ہے بالکل بچوں  
کی سی، زندگی کے کسی نظریے کو، فطرت کے کسی قانون کو پہنے ہی سابقہ میں کبھی  
قبول نہیں کرے گی۔ پہلے شادی سے انکار کرتی رہی۔ جب آمادہ ہوئی تو یہی  
بننے سے انکار کر دیا۔ یومی بننے پر جوں توں رضامند ہوئی تو ماں بننے سے منکر  
ہو گئی۔ بھینیس اٹھائے گی، مصیبتیں برداشت کرے گی، مگر ضد سے کبھی باز نہیں  
آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی اس کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ زندگی کے  
حقائق سے مدچار ہو کر بلکہ طحطا طحلا کر ان کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اُس  
کی ہر بات خرابی ہے ۔

صحت کے زندہ اور مرنا نہ کرنا میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بُری طرح مبتلا ہیں، لیکن نفرت کا انہماک کیے چلے جاتے ہیں۔ جی گال چومنے کو چاہتا ہے لیکن اس میں سوئی کھودیں گے۔ بوے سے تھکنا ہوگا تو ایسی دھول جھائیں گے کہ دوسرا بللا لٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو محض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے عام طور پر صحت کے انسانوں میں ایک نہایت رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

صحت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا۔ اور میں اسے دیکھتے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

صحت سے تھے جلتے مجھے پانچ چھ برس ہو گئے ہیں۔ دونوں کی آتش لگ کر اور ہیک سے اڑ جانے والی طبیعت کے پیش نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سبکدوشوں وراثیاں ہوتیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک باپ بچ ہوئی اور وہ بھی بلی سی۔

شاہد اور صحت کے مدعو کونے پر میں اور میری بیوی مضیہ دونوں بلاؤ زبیدی کے مشافعات میں ایک جگہ جہاں شاہد بیٹی ڈائیز کی ملازمت کے دوران میں مقیم تھا، گئے ہوئے تھے۔ رات کا کانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا "منو" تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

غیر معمولی تک میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

شاہد تنک گیا۔ دو بچے مک عصمت نے اپنے شوہر کی بیروی کی میں پھر بھی  
 نہانا، دفن کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا  
 میں نے جھٹ سے کہا: "صحیح لفظ دراز دستی ہے"۔ تین بچے گئے، عصمت نے  
 اپنی خطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی۔ شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے  
 کمرے سے لغت اٹھا لایا۔ "و" کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہیں  
 تھا، البتہ دراز دستی اور اس کے معنی درج تھے۔ شاہد نے کہا: "عصمت! اب  
 تمہیں اتنا پڑھے گا۔۔۔ اب میاں بیوی میں پنج شروع ہو گئی، مرغ  
 اذانیں دینے لگا، عصمت نے لغت اٹھا کر ایک طرف چھینکی اور کہا:۔  
 "جب میں لغت بناؤں گی تو اس میں صحیح لفظ دست درازی ہو گا یہ کیا  
 ہوا دراز دستی۔۔۔ دراز دستی۔"

کچ بھٹی کا یہ سلسلہ دراز یہ حال ختم ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے  
 سے کبھی نہیں دوسرے جگہ یوں کہیں گے کہ ہم نے اس کا کبھی ہوتے ہی نہیں آنے  
 دیا۔ گفتگو کرتے کرتے جب بھی کوئی خطرناک موڑ آیا تو عصمت نے رخ بدل  
 لیا یا میں راستہ کاٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں، وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن اگر کوئی  
 دفتر پوچھ بیٹھے، تم دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو؟ تو میرا خیال  
 ہے کہ میں اور عصمت دونوں کچھ عرصے کے لئے بالکل خالی الذہن ہر جا میں۔

صحت کی شکل و صورت و غریب نہیں لیکن دل نشیں ضرور ہے۔ اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنی کی سفید ساڑھی، سفید زمین کا کالی کٹری مکپوں والا پست بلادر اتھ میں چھوٹا پرس، پاؤں میں بیڑاڑھی کا بانڈن چپل چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور مقبض انگلیوں پر مٹے مٹے شیشوں والی عینک چھوٹے مگر گنگھریلے بال — میڈی ہانگ۔ ذرا سا مسکانے پر کبھی گالوں میں گڑھے بڑپڑ جاتے تھے۔

میں صحت پر عاشق نہ ہوا۔ لیکن سیری، رمی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ صحت سے اگر حنفیہ اس کا ذکر کرے تو ضرور کچھ یوں کہے گی: بڑی آئی، بڑی محبت میں گرفتار ہوئی تھی۔ تہذیبی عمر کی لڑکیوں کے باپ تک تید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں ایک بزرگوار اہل تہذیب تو ہیں ہی جانتا ہوں۔ جو بہت دیر تک صحت کے پیہم پہلے رہے۔ خط و کتابت کے ذریعے سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا بصحت مشابہہ دیتی رہی لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ ثریا ہی دکھا دی غریب کو۔ یہ سچی کہانی میرا خیال ہے وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہو جانے کے خوف سے میرے اور صحت کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوتی تھیں۔ میرا افسانہ کبھی شاخ ہو تو پڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی۔ نیلم کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش و خروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ واقعی یہ بہن بننا کیا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کسی عورت کو بہن کہنا اس کی توہین ہے؟



اور میں سوچتا رہ گیا — وہ مجھے منٹو بھائی کہتی ہے اور میں اسے عصمت بہن کہتا ہوں — دونوں کو خدا سمجھے !

عامری پانچ چھ برس کی دلکستی کے زمانے کا ایسا کوئی واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا ہے۔ لیکن عصمت کا پہلا موقع تھا۔ اس نے بہت بھائی۔ اتفاق سے گرفتاری غیر قانونی تھی۔ کیونکہ پنجاب پولیس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت غرض ہوئی۔ لیکن بکریے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بیٹی سے لاہور تک کافی مباحثہ ہے۔ لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے۔ سارا وقت خوب ہنگامہ مچا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور پڑاٹے کی خاطر ہم دونوں کی فٹننگاڑی پر غلے کھاتے رہے۔ قید کی صورتوں کا نقشہ کیسٹیا۔ سبیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر میں جھٹکا کر کہا: 'سوئی پر بھی چڑھا دیں۔ لیکن یہاں صلیق سے انالختی ہی نکلے گا۔'

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ کابلوں کے تماشائی طالب علم تھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹوریاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا: 'منٹو بھائی جو ہماری تہذیب سے کیسے کر ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آئے جانے کا کرایہ ہی نکل آئے گا۔'

## عصمت چنتائی

ہم دو دفعہ لاہور گئے اور دو ہی دفعہ ہم دونوں نے کڑاں شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جٹے سینڈلوز اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا، لاہور آپ کیا مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟ عصمت نے جواب دیا: جی نہیں جتے خریدنے گئے تھے!

غالباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات ہے، بھولی کا تہوار تھا۔ عاڈ میں شاہدار میں بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے، عصمت میری بیوی کو اکسا رہی تھی؟ صنفیہ یہ لوگ اتنا روپیہ اڑائیں، اہم کیوں زندہ اس عیش میں شریک ہوں؟۔۔۔ دونوں ایک گھنٹے تک دل کڑا کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک دم ہڑسا مچا اور نعمتان سے پر وڈو ہر مگر جی ان کی بیماری بھر کم بیوی اور دوسرے لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ چند منٹوں میں ان کا حلیہ ناقابلِ شناخت تھا، عصمت کی توجہ دسکی سے ہٹی اور رنگ پر مرکوز ہو گئی! آؤ صنفیہ ہم میں ان کے رنگ لگائیں!

ہم سب بازار میں نکل آئے۔ چنانچہ گھوڑ بندر روڈ پر باقاعدہ بھولی شروع ہو گئی! نیلے پیلے سبز اور کالے رنگوں کا چھڑکاؤ سا شروع ہو گیا، عصمت پیش پیش تھی۔ ایک موٹی بھان کے چہرے پر تو اس نے تارکول کا لپ کر دیا، اس وقت مجھے اس کے سہاقی عظیم بیک چنتائی کا خیال آیا ایک دم عصمت نے جرسٹوں کے سے انداز میں کہا: آؤ، پری چہرہ کے گھر پر دھاوا بولیں!

اُن دنوں نسیم بانو ہمارے قلم چل چل رہی تھیں، میں کام کر رہی تھی۔

اس کا جگہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی، چنانچہ چند نمشوں میں ہم سب جگے کے اندر گئے۔ نسیم حسبِ عادت پورے ایک اپ میں تھی اور نہایت نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑھی میں طبوس تھی وہاں اس کا خاوند احسان بہادر شور سن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جزدگوں میں اتھری ہوئی بھٹی سی لگتی تھی میری میری سے جس پر مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا۔

نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا: ”منیہ، نسیم واقعی حسین عورت ہے۔“  
میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا: ”میں نے لیکن میت ٹھنڈا۔“  
جینک کے رنگ اور خوشیوں کے پیچھے عصمت کی چوٹی چھوٹی آنکھیں گھومیں اور اس نے آہستہ سے کہا: ”مغربی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور ایک سیکنڈ کے بعد پرسی چہرہ نسیم سرس کا مسخرہ بنی تھی۔

عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں: ”منشور ہائی جی چاہتا ہے اب مرغ اور غریبوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں“ یا ”میں تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی اور ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی۔“

چند مہینوں کی بات ہے میں اور عصمت بیٹھی ٹاکیڈ سے وہیں ایکٹرک ٹرین میں گھر جا رہے تھے میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا: ”کرشن چندر

کے افسانوں میں دوسری چیزیں میں نے عام دیکھی ہیں..... زنا بالجبر اور قوس قزح جیسے وہ قوس و قزح کہتا ہے۔ ”عصمت نے دہلپی لیتے ہوئے کہا ”یہ تو ہے۔“  
 ”سچتا ہوں ایک مضمون لکھو۔ جس کا عنوان کرشن چندر، قوس قزح اور زنا بالجبر ہو۔ میں ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا: لیکن زنا بالجبر سے قوس قزح کا انبیائی رشتہ کیا ہو سکتا ہے؟“

عصمت نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا: ”جہاں انبیائی نقطہ نظر سے قوس قزح کے رنگوں میں انتخابی جاؤ بیت اور کشش..... لیکن آپ تو کسی اور دایہ سے سوچ رہے تھے۔“

”جی ہاں..... سُرخ رنگ آگ اور خون کا رنگ ہے حنیات میں اس رنگ کو مریخ یعنی جلاؤ رنگ سے منسوب کیا جاتا ہے..... ہو سکتا ہے کہ زنا بالجبر سے قوس قزح کے صرف اسی رنگ کا دامن بندھا ہو۔“  
 ”ہو سکتا ہے..... آپ یہ مضمون ضرور لکھتے۔“

”لیکن عیسائیوں کے فین مصوری میں سُرخ رنگ عشقِ الہی کا منظر ہے...“  
 ”..... نہیں نہیں۔“ میرے دماغ میں دفعتاً ایک خطیہ چھوٹا ”میلیب پرچہ“ چھٹنے کے شدید جذبے کو بھی اسی رنگ سے منون کیا گیا ہے اور کنواری مریم کا ہاں سُرخ ہوتا ہے..... یہ عصمت کی نشانی ہے.....“

یہ کہتے کہتے میں نے اچانک عصمت کے سفید لباس کی طرف دیکھا وہ سکاروی

”منٹو جانی آپ یہ مضمون ضرور لکھئے، مزہ آجائے گا.... لیکن عنوان میں سے بالآخر اڑا دیجئے“

کوشش کو اعتراض ہو گا کیونکہ وہ جبرئیل فصل سمجھ کر ہی تو دوتا ہے ؟  
”بیکار دوتا ہے۔ کیا معلوم کہ یہ ظلم ہی اس کی مظلوم ہیروئنوں کو اچھا لگا ہوتا ہے“

اللہ بہتر جانتا ہے !  
عصمت کی افادہ نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں، حق میں کم، مخالف  
کچھ تو باطل مجذوب کی بڑھیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین آسمان کے تقابے  
ملنے لگتے ہیں۔

پطرس صاحب کے بھی جن کو لامہد کے ادبی ٹھیکیداروں نے ڈیریا  
میں بند کر رکھا تھا اپنا ڈھتہ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ  
دیا آدمی زمین میں طبیعت میں شرفی اور مزار ہے اس لئے مضمون کافی دلچسپ  
اور سلیبا ہوا ہے۔ آپ عصمت کے لیس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ایک مقتصد و پختہ کار دیباچہ نرپس دآپ کی مراد صلاح الدین  
صاحب سے ہے، انے بھی معلوم ہوتا ہے۔ ان پڑھنوں  
کے دیوڑ میں زرا اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت  
کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش

انہیں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک زلے میں انگریزی ادب میں جانج ایلٹ کو نصیب ہوا۔ گویا ادب کوئی شخص نور نامنٹ ہے جس میں محروموں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں۔

”جانج ایلٹ کا رتبہ مسلم لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تنگ ہی ملا اور برصغور کو کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا موضوع ہے کہ کیا کوئی ابالاتیاز ایسا ہے۔ جو خاندانی اور جنگی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جہلی اور بنیادی اور انشا پر داز محروموں کے ادب کو انشاء بد داز محروموں کے ادب سے تمیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ ہو بہر حال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے ”الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔“

ان سوالوں کا جواب بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے لیکن جواب دینے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے۔۔۔۔۔ مرد یا عورت؟ کیونکہ صنف معلوم ہونے پر سوال کرنے والے کا جہلی اور بنیادی زاویہ نگاہ

بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔

پطرس صاحب کا یہ کہنا کہ ”گویا ادب بھی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں“ ٹینسٹ پطرس فقرے بازی ہے ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں۔ لیکن عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہونا بے ادبی بھی نہیں۔

پطرس صاحب کلاس میں کچھ فریٹے میں تڑپ رہے اور ملاقات سے ان کا خطاب جداگانہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب انہیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کے دماغی نشوونما پر غور کرنا پڑے گا تو ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ ان کی جنس سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔

عورت اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور نہ کیا جائے۔ معجزے کے ادب کے متعلق بھی کیا پطرس صاحب یہی استفسار فرمائیں گے کہ کیا کوئی ماہر الامتیاز ایسا ہے۔ داخل اور حلقی اور بنیادی جو افتخار پر دوازہ معجزوں کے ادب کو افتخار پر دوازہ مردوں اور عورتوں کے ادب سے تمیز کرتا ہے۔

میں عورت پر عورت اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا سمجھتے ہیں کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مسجدوں اور مندروں پر یہ لہجہ ڈگنا کہ یہ عبادت اور زندگی کی جگہیں ہیں بہت ہی مضحکہ خیز ہے لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں

## عصمت چٹائی

کسی عام رہائش گاہ کو روکو کہ ہم نئی تعمیر کا جاموہ لیں گے تو اس پر مندا اور مسجد کی تقدیر لیس کا اثر اپنے ذہن سے غور نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر نقطے میں موجود ہے جو اس کو سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہادی رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خرمیوں اور کمیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانبداری سے بیان کیا ہے۔ ہم مصنف کی جنس سے علیحدہ نہیں کر سکتے اور نہ ایا کرنے کے لئے کوئی تنقیدی، ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔

عزیز احمد صاحب "نیا دور" میں عصمت کی "خیر صحت کیر" پر تنقید کرنے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جسم کے اعتبار کا عصمت کے پاس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے مساس۔ چنانچہ رشید سے لیکر شیلنگ ہمیں مرد جو اس ناول میں آتے ہیں سب کا اندازہ جسمی یا ذہنی مساس سے کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مساس کی کیفیت انفعالی ہی ہوتی ہے مساس ہی عصمت کے یہاں احتسابِ مرد، اعتبارِ انسان احتسابِ زندگی، اعتبارِ کائنات کا واحد ذریعہ ہے۔

رمانیوں کے بادلوں میں عباس کے ماتھے بھلیوں کی طسروں کو نہتے ہیں اور روکیوں کے گروہ میں نخی نخی لڑکیاں چلی چلی



کر بکھر جاتی ہیں۔ رسولِ خاطر کے چوہے جیسے ہاتھ مساس کا نادر یک  
 رخ ہیں۔ نیم تار یک رخ میٹرن کا وہ منافرہ یا مہاشقہ ہے۔ جس  
 میں میٹرن کو تعجب تھا کہ ذہن میں لاکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں  
 اپنی رانوں پر دھینگتی ہوئی عسوس نہیں کرتیں۔ مساس کے سلسلے  
 میں شستن کا نسوانی احساس ریپرس صاحب متوجہ ہوں) ران پر  
 کی انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا ہے۔ ۱۱۱۱

عوزی احمد صاحب کا یہ نظریہ غلط ہے کہ عصمت کے یہاں احتساب کا ذریعہ  
 ایک فقط مساس ہی ہے۔ اول تو مساس کہنا ہی غلط ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسا  
 عمل یا فعل ہے جو کچھ دیر جاری رہتا ہے عصمت تو غایت درجہ ذکی الحس ہے۔  
 ہکا سلس ہی اس کے لئے کافی ہے۔ عصمت کے یہاں آپ کو دوسری جہانی  
 حسین جس عمو عمل نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر سو گھنے اود سننے کی جس موت کا  
 تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ عصمت کے ادب سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔

”گھر گھر۔ چٹ خوں۔ فٹش“ باہر برآمدے میں موٹر بھنار ہی تھی۔  
 ”دیڈیو کو مروڑتے دے۔ کھڑکھڑا کر ڈھنڈھ۔ گھر گھر“ میرے اگسٹل آئے۔  
 ”ٹنن ٹنن۔ سامیٹل کی ٹھنٹھ جی۔ میں کچھ گئی۔ ایڈنا نا گئی۔ رے پکڑا  
 ”اود جو دما اونگھنے کی کوشش کی تو دھم دھم ٹھٹھوں کی آواز چھت پرائی۔  
 ”اود دھم دھم چھن چھن کرتی بہو سرسوسوں پر سے آتری۔“

”عَنْ عَن، عَنْ عَن، بہرمنشائی“  
 ”مکملی تن تن کر کے وہ گئی“ (راس)  
 ”بچہ کون کون کر کے چہرہ چڑھانے لگتا“ (سفر میں)  
 ”ہلی کی طرح سپر سپر رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آئے گئیں“ (لحاف)  
 ”ٹمک ٹمک، ٹمک ٹمک۔ گرمی کی طرح اس کا دل ہلنے لگا“  
 ”ہوتے ہوئے قبضے لگاتے ہوئے پھرتے“ (رق)  
 ”ایک پراسرار قبرستانی سسکی ہوا میں لڑتی ہے“ (دھبہ میں سے)  
 ”گھنگھروڑوں کی جھنگاڑی تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں  
 دینگ کر ہزاروں نبضوں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں“ (پیشہ)  
 ”اسی طرح سونگھنے کی سی بھی جگہ جگہ مصروف ہے۔  
 ”اور بو تو دیکھو، حلقے کی سڑاند ہے۔ توبہ، تھو“  
 ”توام کی بواہیں بس گئی تھی کہ اسے نیند نہ آئے“ (رڈائن)  
 ”موسوں کا تیس آٹھویں دن ہی کھن کھن بوندیٹے لگتا“ (نیرا)  
 ”اد جسم سے عجیب گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے تھے“  
 ”گرم گرم خوشبوؤں کے عطرنے اور بھی انہیں اتکارہ بنا دیا“  
 ”میں نے نیتھنے پھیلا کر“ سوں سوں“ ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور  
 حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ محسوس نہ ہوا“ (لحاف)

”سرد آہوں اور سینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر دکھا دیا تھا۔ دنگ  
پہینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چمراندے سے آنے لگی  
تھی“ (جال)

”مردانہ قبض۔ سگریٹ کی بو میں غرق لگی سی“ (میرزا)  
”نیچے کیاریوں میں سے دھننے کی ننھی ننھی پتیاں ترڑ کر سونگھنے  
لگی“ (میرزا پتہ)

عصمت کی سب حسین وقت پر مرنے — پر اپنی اپنی جگہ کام کرتی  
ہیں اور تنہیک طور سے کرتی ہیں، عزیز احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جنس ایک  
مرض کی طرح عصمت کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے، ممکن ہے ان کی  
تشخیص کے مطابق درست ہو۔ مگر وہ اس مرض کے لئے نئے نئے نمونہ نہ  
فرماتیں۔ یوں تو لکھنا بھی ایک مرض ہے، کمال طور پر صحت مند آدمی  
جس کا درجہ حرارت ہمیشہ ساڑھے اٹھانوے ہی رہے۔ ساری عمر  
اپنی زندگی کی ٹھنڈی سیلٹ ٹاتھ میں لئے بیٹھا رہے گا۔  
عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں:-

عصمت کی بیرونی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ  
دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاٹا اور نہ اس  
نے کسی مرد کو عشق ایک ایسی چیز ہے جس کا جسم سے

وہی تعلق ہے جو سبلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دیا تو یہی  
 عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی  
 جھلٹی لوہی پٹکھا جلتا ہے۔ ہزاروں دیوؤں کی طاقت  
 سے زندگی کی عظیم الشان مشینوں کے پیچھے گھماتا ہے اور  
 کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے  
 ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیت مصنفہ واقف نہیں۔

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا انوس ہے۔ گریہ عشق جس سے  
 عزیز احمد صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے بیچ سالاسکھوں  
 کے ماتحت تمیذ کیا ہے ادب وہ اسے ہر انسان پر عائد کر دینا چاہتے ہیں  
 عزیز احمد صاحب کو غرض کرنے کے لئے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی  
 بیرونی ٹریمبڈی کیسے وقوع پذیر ہوئی کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاٹا اور  
 نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد صاحب کے تصنیف کردہ عشق سے نا آشنا ہے  
 اداس کی یہ نا آشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے اگر آج اس کی زندگی کے  
 تماروں کے ساتھ اس عشق کی بجلی جھڑ دی جائے اور کھٹکا دیا دیا جائے تو بہت  
 ممکن ہے ایک اور عزیز احمد پیدا ہو جائے۔ لیکن تل۔ گیند: "مہجول بھلیاں"

اور "جال" تعین کرنے والی عصمت یقیناً مر جائے گی۔

عصمت کے ڈرامے کمزور ہیں۔ جگہ جگہ ان میں جھول ہے۔ عصمت پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہے کرناپ کر قہچی سے نہیں کرتی۔ یوں ہی دانتوں سے چیر چاڑھ کر چھیڑ بنا ڈالتی ہے۔ پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا ہیں اس میں وہ بالکل اجنبی رہتی ہے۔ جنس عصمت کے اعصاب پر ایک مرض کی طرح سوار ہے۔ عصمت کا بچپن بڑا غیر صحت بخش رہا ہے پردے کے اس پادک لفظیات بیان کرنے میں عصمت کو بد طولی حاصل ہے۔ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔ شخصیتوں سے نہیں اشخاص سے ہے، عصمت کے پاس جسم کے اعتبار کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ساس.... عصمت کے افسانوں کی کوئی سمت ہی نہیں.... عصمت کی غیر معمولی قوت مشاہدہ حیرت میں غرق کر دیتی ہے.... عصمت فحش نگار ہے.... ہلکا ہلکا طنز اور مزاح عصمت کے اسٹائل کی متاثر فرمیاں ہیں.... عصمت تلوار کی دھار پر چلتی ہے۔

عصمت پر سب کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کوئی اسے پسند کرے گا۔ کوئی ناپسند۔ لیکن لوگوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے زیادہ اہم چیز عصمت کی تخلیقی قوت ہے۔ بری، جلی، عریاں، مستعد عریٰ بھی ہے قائم رہنی چاہیے ادب کا کوئی جواز فیہ نہیں۔ اسے نقشر اور خاکوں کی قید سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہیے۔

عرسہ مہادہلی کے ایک ذات شریف پولیش نے عجیب و غریب حرکت کی آپ نے  
 "اوروں کی کہانی سن میری زبانی" اس کے پڑھنے سے بہتوں کا جھلا ہو گا۔  
 جیسے عنوان سے مشائق کی۔ اس میں میرا، عصمت، معنی، پریم چند، خواجہ  
 محمد شفیع اور عظیم بیگ چشتی کا ایک ایک انسانہ شامل تھا۔ ویسا ہے میں ترقی  
 پسند ادب پر ایک تنقیدی چرٹ ماروں گشتا پھوٹے آنکھ کے بعد ذاتی فریادی گئی  
 تھی اور اس کا رنایے کو اپنے دونوں نئے نئے بچوں کے نام سے مضمون کیا گیا تھا۔ اس کی  
 ایک کاپی آپ نے عصمت کو اور مجھے روانہ کی۔ عصمت کو دلش کی یہ  
 ناشائستہ اور جھوٹی حرکت سخت ناپسند آئی۔ چنانچہ بہت بہتا کر غصے  
 ایک خط لکھا:-

منو بھائی آپ نے وہ کتاب جو دلش نے بھجالی ہے  
 دیکھی؟ ذرا اسے چٹکا دیے اور ایک نوٹس دیجئے۔  
 یہی طور پر کہ ہر مضمون کا جرمانہ دو سو روپے دو درت  
 دعویٰ مٹونک دیں گے۔ کچھ ہونا چاہیے۔ آپ بتائیے  
 کیا کیا جائے۔ یہ خوب ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے اس کا  
 ہمیں کیڑا میں تھیر دیتا ہے اور ہم کہ نہیں کہتے فردہ مزہ  
 رہے گا۔ اس شخص کو خوب رگڑ دیتے آتے مگر اُتار  
 عظیم وار کیوں بن رہا ہے عربیاں ادب کا اکہ نے ہمارے

افسانے صرف کتاب فروخت کرنے کیلئے چاہے ہیں  
 ہماری ہشک ہے کہ ہمارے غیرے غصوں کے کم غفلوں  
 کی ڈانٹیں سننا پڑیں۔ جو کہ میں نے کھانا ہے اس کو  
 سامنے رکھ کر ایک مضمون لکھتے آپ کہیں گے میں کیوں  
 نہیں کہتی تو جواب ہے کہ آپ پہلے ہیں۔

جب محنت سے عاقبت ہوئی تو اس خط کا جواب دیتے ہوئے میں نے  
 کہا: سب سے پہلے لاہور کے چوبندہ محمد حسین صاحب میں ان سے ہم فرات  
 کریں تو وہ ہر دو شرطیں پر مقدمہ چلا دیں گے؟  
 عصمت سکرائی: تجویز تو خشک ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم بھی ساتھ  
 دھرتے جائیں گے؟

میں نے کہا: کیا بڑا..... عدالت خشک جگہ ہے لیکن کرنل شاپ ترکانی  
 دلچسپ جگہ ہے..... مشورہ پیش کرواناں لے جائیں گے؟ اور..... عصمت کے  
 گاہوں کے گرد سے گھرے ہوئے۔

## مرلی کی دھن

اگر مل کی تینس یا پوئیس تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ دماغ، پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیر علاج تھا کہ شیمام کی موت کی خبر ایک اخبار میں پڑھی۔ ان دنوں ایک عجیب و غریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک پکر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوش مند کی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچتا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈ مڈ ہو گئی تھیں کہ میں خود کو "نیز لینڈ" میں سمجھتا محسوس کرتا تھا۔

شیمام کی موت کی خبر چنانچہ جب میری نظروں سے گزری تو میں نے سب سے سبب ترک شراب کی کارستانی ہے۔ جس نے میرے ذہن میں پہلی پیدا



## گھنچے فرشتے

کردکھی ہے۔ اس سے قبل نیم خوابی کے عالم میں کئی عریضوں کی موتیں میرے لئے واقع ہو چکی تھیں اور نیم پرشمنندی کے وقت مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ سب کے سب زندہ ہیں اور میری صحت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے یہ خبر پڑھی تو ساختہ والے کمرے کے پاگل سے کہا: "جانتے ہو۔ میرا ایک نہایت ہی عزیز دوست مر گیا ہے۔" اُس نے پوچھا: "کون؟"

میں نے گلو گریا میں جواب دیا: "شیام؟"  
 کہاں؟ یہاں پاگل خانے میں؟

میں نے جواب کوئی نہ دیا۔ اور نکلے کئی تصویریں میرے مضطرب دماغ میں ابھریں۔ جن میں شیام تھا، مسکراتا شیام، ہنساتا شیام، شہد ہجرتا شیام، زندگی سے بھرپور شیام، موت اور اُس کی ہون کیوں سے قطعاً نا آشنا شیام، میں نے سوچا جو کچھ میں نے پڑھا ہے بالکل غلط ہے .... ۔ اختیار کا وجود میرے دماغ کی اختراع ہے۔

آہستہ آہستہ امکان کی دھند دماغ سے ہٹنے لگی اور میں تمام واقعات کو ان کے صحیح حدود و خال میں دیکھنے لگا۔ مگر یہ عمل کچھ اس قدر سست رفتار تھا کہ جب میں شیام کی موت کے حادثے سے دوچار ہوا تو مجھے زیر دست دھکا نہ لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ عرصہ ہوا مریض تھا اور اس کی موت کا صدمہ بھی عرصہ ہوا مجھے پہنچ چکا تھا۔ اب صرف اس کے



یہ نعرہ بلند کر رکھا: "شیام زندہ باد!"

مجھے یقین ہے موت کے ہونٹوں کو بڑے خلوص سے چومتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوتا: "منٹو — خدا کی قسم ان ہونٹوں کا مزہ کچھ اور ہی ہے!" میں جب بھی شیام کے تعلق سوجھتا ہوں تو مجھے منہ پر روسی ناول نہیں آتا۔ تجربی شیف کا ہیرا سنیاؤں یاد آجاتا ہے۔ شیام عاشق تھا، عشق پیشہ نہیں تھا۔ وہ ہر خوبصورت چیز پر مرتا تھا — میرا خیال ہے کہ موت حضورِ غرب صورت ہو گی اور وہ کبھی نہ مڑتا۔

اُس کو تپش اور جدت سے پیارت۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں میں نہیں مانتا۔ شیام ٹھنڈے ہاتھوں کا باطل قائل نہیں تھا۔ اگر واقعی موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے تو اس نے یہ کہہ کر ایک طرف جھٹک دیلے ہوتے — "جھوٹری بنی — تم میں خلوص نہیں ہے!" مجھے ایک خط میں لکھتا ہے -

قہقہہ بیسے جان من! کہ یہاں ہر ایک ہپ ٹلان ہے  
لیکن جیسی "ہپ ٹلان" یہاں سے بہت دور لیکن میری پوچھے  
ہرگز بھی کوئی ایسی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حرفِ شکایت  
لبہ پر لائوں... زندگی خوب گزر رہی ہے — زندگی  
مے نوشی! مے نوشی! زندگی! ساتھ ساتھ چل رہی ہے

تبھی (فتاز) چھ بھینے کے حرسے کے بعد واپس آگئی ہے  
وہ ابھی تک میری ایک بڑی زبردست کمزوری ہے اور  
تم جانتے ہو عورت کی محبت کی گرمی کی راحت محسوس کرنا  
کتنی فرحت انگیز چیز ہے!..... آخر میں انسان ہوں  
ایک نرمل انسان۔

نگار (نگار سلطان) کبھی کبھی مٹی ہے۔ بیسکن اولیٰں حق  
میت کا ہے۔

شاموں کو تہمدی دانشمندانہ کجواس اکثر یاد آتی ہے۔

شیام نے اس خط میں ایک لفظ "ہپ ٹلا" استعمال کیا ہے اس کی تشریح  
چونکہ خالی از دہلی نہیں۔ اس لئے آپ بھی سن لیجئے۔

میں بیٹی ٹائینوس ملزم تھا۔ ان دنوں کمال امرودی کی فلمی کہانی "حویلی" (جو  
اصل کے نام سے فلمائی گئی) کی تشکیل و تکمیل ہو رہی تھی۔ اشوک، واجہا حسرت  
دیکھتوی) اور میں سب ہر روز بحث و تمیص میں شامل ہوتے تھے۔ ان نشستوں  
میں کام کے علاوہ کبھی کبھی خوب زور دوں پر گپ بھی چلتی تھی۔ ایک دوسرے سے  
مذاق ہوتے شیام کو جب فلم "ہیوز" کی خوشگ سے قرارت ہوتی۔ ترودہ بھی  
ہمارے محفل میں شریک ہو جاتا۔

کمال امرودی کو عام گفتگو میں بھی ٹیٹ قسم کے ادبی الفاظ استعمال کرنے



نہیں بنی — کوئی ہپ ٹلا چیز پیش کرو۔ ہپ ٹلا۔

دوسری مرتبہ ہپ ٹلا کہہ کر میں نے سب کی طرف ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے دیکھا۔ یہ لفظ اب معنی اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نشست میں بلا تکلف میں نے اُسے استعمال کیا۔ ہپ ٹلیٹی نہیں۔ ہپ ٹو لائز کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ لیکن اچانک ایک بار اشوک عجب سے مخاطب ہوا: ہپ ٹلا کا اصل مطلب کیا ہے؟ کس زبان کا لفظ ہے؟

شیام اس وقت موجود تھا۔ جب اشوک نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ اس نے زور کا تقہر لگایا۔ اس کی آنکھیں سُرگئیں۔ ترین میں وہ میرے ساتھ تھا۔ جب میں نے کرکٹ کے کھلاڑی کے اس عجیب و غریب نام کی طرف اس کو متوجہ کیا تھا، منس ہنس کے دوہرا ہوتے ہوئے اس نے سب کو بتایا کہ یہ منٹو کی نئی منوٹیت ہے جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو ہپ ٹلا کو پہنچ کر فلمی دنیا میں لے آیا۔ مگر کھینچا تانی کے بغیر یہ لفظ بیٹے کے فلمی حلقوں میں رائج ہو گیا۔

۱۹۶۷ء کے خط میں شیام مجھے لکھتا ہے۔

ہیارے منٹو اب کی دفعہ تم پھر خاموش ہو۔ تہلاری یہ خاموشی مجھے بہت دق کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ میں تمہارے دماغی تساہلی سے بخوبی واقف ہوں۔ میں غصے سے دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جبکہ تم یکوقت ٹپ ساٹھ

ہیتے ہو۔ اس میں شک نہیں کریں بھی کوئی بہت بڑا خطبہ  
نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ایسے خط لکھنے اور وصول کرنے میں  
لطف حاصل ہوتا ہے۔ جو ذرا "انگ قسم" کے ہوں۔۔۔۔۔  
یعنی ہپ ٹلا۔

لیکن ہپ ٹلا یہاں بہت ہی نایاب چیز ہو گئی ہے۔۔۔۔  
اسے کاغذ پر لکھو تو کم بخت "ہپ ٹلی" بن جاتی ہے اور اگر  
یہ ہپ ٹلی بھی دستیاب نہ ہو تو بتاؤ کتنی کلفت ہوئی ہے  
سمات کرنا۔ اگر میں نے ہیٹھ لکھنا شروع کر دیا ہو۔۔۔۔  
لیکن کیا کروں۔ جب حقیقتیں گم ہو جائیں تو انسان پمپٹریٹ  
ہی کرتا ہے مگر مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ تم کیا کہو گے کیا نہیں کہو گے  
میں آنا جاتا ہوں۔ اور تمہیں اس کا علم ہو گا۔ کہ تم ایسے بڑے  
ہپ ٹلا کو اس میدان میں شکست دینے کا سہرا صرف  
میرے ہی سر ہے۔

منٹو! کسی نے کہا ہے جب عاشق کے پاس نقطہ ختم ہو  
جالتے ہیں تو وہ چرنا شروع کر دیتا ہے اور جب کسی تفریق  
پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ کھانسنے لگتا ہے۔  
میں اس کہادت میں ایک اور چیز شامل کرتا ہوں جیب مردکی مردانگی

ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ماضی کو پٹ پٹ کر دیکھنے لگتا ہے لیکن تم فکر مند نہ ہونا میں اس آخری منزل سے کچھ دُور ہوں۔ زندگی بہت معروف اور بھرپور ہے۔ اور بھرپور زندگی میں تم جانتے ہو۔ دیوانگی کے لئے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ حالانکہ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

نیم والا فلم (چاندنی رات) / قریب قریب نصف مگن ہو چکا ہے۔ امراتہ سے ایک فلم کا کنٹریکٹ کر چکا ہوں۔ ذرا سوچو تو میری ہیروئن کون ہے؟ — نگار (نگار سلطان) میں نے خود اس کا نام تجویز کیا تھا۔ محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پردے پر ان پرانے جذبات کا اعادہ کیسے لگتا ہے جو کبھی کسی سے حقیقت کی دنیا میں متعلق رہے ہیں — پہلے مسرت تھی، اب محض کاروبار لیکن کیا خیال ہے تمہارا۔ یہ سدا جوش آفریں نہیں رہے گا۔

تکبھی، ابھی تک میری زندگی میں ہے۔ نگار بہت ہی لمبی ہے اور اس کا سلوک بے حد نرم و نازک، پچھلے دنوں سے دیر لایا بھی یہاں بیٹے میں ہے۔ اس سے ملاقات کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک اس کمزوری کو جو اس کے



دل و دماغ میں میری طرف سے موجود ہے منسوب نہیں کر سکی رہتا پتہ ابھی کے ساتھ بھی سیر و تفریح رہی ۔

اور لڑ بڑاٹھے میں ان دنوں فطرتِ عشق کے فن میں اڈو لنس ٹرنینگ لے رہا ہوں۔ مگر دوست یہ سارا سلسلہ بہت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بہر حال میں پیچیدگیاں پسند کرتا ہوں ۔

وہ میرے اندر جو محنت آزما، ہم جو ادارہ گرد ہے ابھی تک کافی طاقتور ہے۔ میں کسی مخصوص جگہ کا نہیں اور نہ کسی مخصوص جگہ کا ہونا چاہتا ہوں۔ میں لوگوں سے محبت کرتا ہوں اور ان سے نفرت کرتا ہوں۔ زندگی یوں ہی گزر رہی ہے۔ دراصل زندگی ہی ایک ایسی مسوڈہ ہے جس نے محبت ہے، روگ جراثیم جہنم میں !

مجھے مصنف کا نام بھول گیا ہے، مگر اس کا ایک ٹیڈیو رہ گیا ہے۔ شاید وہ بھی درست نہ ہو۔ مگر مفہوم کچھ اسی قسم کا تھا۔ ... وہ لوگوں سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ خود کو محبت کہتے ہیں (کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اس طور پر اس سے نفرت کرتا تھا کہ (نفرت کرنے میں خود کو ایک تنہا محسوس کرتا تھا)۔

میں اس میں اور کوئی فقرہ شامل نہیں کر سکتا۔

ان دو خطوں میں تاجی کا ذکر آیا ہے۔ خطوط و مدانی میں اتنا قریب بتا چکا ہوں کہ یہ ستار کی تصویر ہے۔ قمار کون ہے یہ خود شام بتا چکا ہے کہ وہ اس کی کمزوری ہے۔ سچ پوچھیے تو لگا رہو لا سب اس کی کمزوریاں تھیں، عورت وراصل اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور یہی اس کے کردار کا مضبوط ترین پہلو تھا۔

قمار، نریب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن ہے۔ نریب کے ساتھ بچے گئی تو ظہور راجہ کے بھاری بھر کم مشن میں پھنس گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے اپنا واسن چھڑا کر لاہور آئی۔ تو شام کے ساتھ روائس شروع ہو گیا۔ بیٹے میں جب شام کی حالت درست ہوئی۔ تو اس نے اپنے ہمنے والے بچوں کی خاطر اس سے شادی کر لی۔

شام کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر خوبصورت بچوں سے خواہ وہ محدود درجہ بدتمیزی کیوں نہ ہوں۔ طہارت و نفاست پسند طبقتوں کی نظر میں وہ خود بہت بڑا بدتمیز تھا۔ یعنی عورتیں تو اس سے اس کی بدتمیزی کی وجہ سے سوت نفرت کرتی تھیں، مگر وہ بالکل بے پردہ تھا۔ اس نے کبھی ان عورتوں کی خوشنودی کے لئے اپنی عادت سنوارنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ منٹو۔ میری باتیں سن کر یہ ناک سمجھوں چڑھانے والی سائیاں سب جیتی ہیں۔ میک اپ کی دنیا میں رہتی ہیں ۛ

لیکن بعض عورتیں اس کی ہدایتوں سے محبت بھی کرتی تھیں کیونکہ ان میں بستر کی بو نہیں ہوتی تھی۔ شام اُن سے کھلے مذاق کرتا۔ وہ بھی اس سے ایسی باتیں کرتیں جو مہذب سوسائٹی میں قابلِ سترویش سمجھی جاتی تھیں۔ . . . . ہونٹوں پر مسکراہٹیں، چہچس، حق سے قہقہے اچھلتے، ہنستے ہنستے شام کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ دور کوئٹہ میں طہارت پندی نو کیسے کیوں پرآسن جائے اپنے گناہ بخشوانے کی رائیگاں گردش کر رہی ہے۔

شام سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ مجھے بالکل یاد نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سے مٹنے سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ ویسے اب سوچتا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے کہ بیٹی میں اس سے شروع شروع کی ملاقاتیں شاید سیڈی جمیلہ بھی روڈ پر ہوئی تھیں۔ جہاں میری بہن رہتی تھی، ہائی سٹٹ میں بالائی منزل کے ایک فلیٹ میں ڈائننگ روم تھی۔ اس کے اُس شام کا آنا تھا۔ دو تین مرتبہ غالباً میسر ہیوں میں اس سے ملا ہوا۔ یہ ملاقاتیں گوریسی تھیں لیکن غایت درجہ بے تحفہ تھیں۔ کیونکہ شام نے مجھے خود ہی بتا دیا تھا۔ کہ ڈائننگ نام کی عورت جو مسز شام کہلاتی ہے۔ درحقیقت اس کی بیوی نہیں لیکن تصفات کی بنا پر وہ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ہے وہ ازدواجی رشتہ اور اس کے اشتہار کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لیکن جب ایک تکلیف کے سلسلے میں اُسے ڈائننگ کو ہسپتال داخل کرنا پڑا۔ تو اُس نے رجسٹریں اس کا نام مسز شام

ہی مٹھوایا ۔

بہت دیر بعد ڈائنڈ کے شوہر نے مقدسے بازی کی شام کو بھی اس میں چھنایا گیا۔ لیکن معاہدہ رخ ہو گیا اور ڈائنڈ جو کہ اب بھی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور دوزخی جیسی دیکھ چکی تھی شام کی زندگی سے نکل گئی مگر شام اس کا اثر یاد کرتا تھا۔  
 مجھے یاد ہے۔ پڑنے کے ایک باغ میں اس نے مجھے سیر کرتے ہوئے کہا ۔  
 ”نٹو۔ ڈائنڈ گریٹ عورت تھی — خدا کی قسم جو عورت اسقاطِ پردہ داشت کر سکتی ہے۔ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی صوبت کا ستارہ کر سکتی ہے ؛ لیکن فردا ہی اس نے کچھ سوچ کر کہا : ”یہ کیا بات ہے نٹو۔ عورت پہل پہل سے کیوں ٹھرتی ہے ۔ کیا اس لئے کرے گناہ کا ہوتا ہے ؛ مگر یہ گناہ اور ثواب کی بکواس کیا ہے۔ ایک نرٹ اصلی یا جعلی ہو سکتا ہے ۔ ایک پتہ حلال کا یا حرام کا نہیں ہو سکتا۔ وہ جھٹکے یا کھڑے کے چھری پھرنے سے پیدا نہیں ہوتا ۔ اس کی پیدائش کا موجب تو عظیم الشان دیرانگی ہے ۔ جس کے مرکب سب سے پہلے باوا آدم اور اماں حوا ہوئے تھے — آہ یہ دیرانگی !“

اور وہ دیر تک اپنی مختلف دیرانگیوں کی باتیں کرتا رہا ۔

شام بہت جلد ہانگ تھا۔ اس کی ہر بات، اس کی ہر حرکت اس کی ہر آواز اُنچے سروں میں ہوتی تھی۔ اعتدال کا وہ بالکل قائل نہیں تھا۔ محفل میں سنجیدگی و مسامت کی ٹپائی بہن کر بیٹھا اس کے نزدیک سفرِ دین تھا۔ شعلے مے قریشی کے دیوان

میں خاص طور پر اگر کوئی خاموش ہو جاتا یا نفسی بن جاتا۔ تو اسے ناقابلِ بیان گرفت ہوتی۔ اس قدر جھنجھلا جاتا کہ بعض اوقات بڑی اور گلاس توڑ پھوڑ کر گالیاں دیتا فضل سے باہر چلا جاتا۔

پوٹے کا ایک واقعہ ہے۔ شام اور مسود پر دینو دونوں زبیدہ کا بیچ میں جھپتے تھے ایک کہانی فردوس کے سلسلے میں مجھے وہاں بٹھرایا تھا۔ مسعود طبعاً خاموشی پسند ہے۔ شراب پی کر وہ اور بھی زیادہ سہجہ ہو جاتا۔ ایک دن صبح سے دم کا دور شروع ہوا۔ اس دوران میں کئی آٹے اور بہک کر چلے گئے۔ میں مسعود اور شام بڈھے ہوئے تھے۔ مشام بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ وہ بچکنے والوں سے مل کر جی بھر کے شور مچاتا رہا تھا۔ مگر شام کے قریب اس کو دھڑکے محسوس ہوا کہ مسود دن کی تمام ہاؤ ہوئے سے الگ تنگ رہا ہے۔ منٹے سے چڑا پنکھوں کو کیڑا کر اُس نے مسود کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیوں حضرت پر دینو۔ کیا آپ نے اپنا مٹی مکمل فرمایا ہے؟"

مسود حسبِ عادت مسکرا دیا۔ اتنے میں کرشن چندر آگیا اور شام مسود کی سہجہ مسکراہٹ کے پیدا کردہ اثر کو بھول گیا۔ دو ایک دوسرے تو شام نے کرشن سے مسود کے ناقابلِ برداشت انجاء کا ذکر کیا۔ کرشن کی زبان کا تالا کھولنے کے لئے دو پیگ کافی تھے۔ چنانچہ مسود سے مخاطب ہو کر اس نے لعنِ طعن شروع کر دی۔ تم کیسے شام پر دینو۔ صبح سے پی رہے ہو اور تم نے ابھی تک

کوئی ماہیت بات نہیں کی۔ خدا کی قسم جو شاعر ماہیت کو اس کرنا نہیں جانتا وہ شاعری بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے ہجرت ہے کہ تم شاعری کیسے کر لیتے ہو۔ میرا خیال ہے تہادی یہ شاعری یقیناً کو اس ہوگی۔ اور تہارا پی کریوں کیسٹر آئل کی بوتل بن جانا تہادی اصل شاعری ہے؟

یہ سن کر شام اس قدر ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ جب کچھ دیر تک مسودے سے چھڑ جباری رہی تو وہ اگلا اٹھ کر اس نے ہم سب کے گلاس خالی کر دیے اور کہا: "چلو باہر چلیں۔"

ہم باہر نکلے۔ مسودہ کے کہنے پر سب نے اپنے جوتے اتار کر جیپوں میں رکھ لیئے۔ اور دوڑنے لگے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے پڑنے کی ٹرٹریس سنسن تھیں۔ میں مسودہ، شام اور ایک اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ دیوانہ دلہ شور مچاتے دوڑ رہے تھے۔ بالکل بے مطلب! اپنی منزل سے نا آشنا۔

راستے میں کرشن چندر کا مکان پڑتا تھا۔ وہ دوڑ سے پہلے ہم سے الگ ہو کر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھولا کر ہم نے اسے بہت پریشان کیا۔ اس کی تھینہ خاتون ہلار شور مں کر دوسرے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس سے کرشن اور بھی تریادہ پریشان ہوا۔ جس کے پیش نظر ہم واں سے رخصت ہوئے اور پھر فرک چبائی شروع کر دی۔ پڑ مندروں کا شہر ہے۔ ہر فرکانگ چمائی ایک مندر ضرور ہوتا ہے۔ مسودہ نے ایک کا گھنٹہ بجایا۔ میں اور شمیم مسجد سے مں چلے گئے اور شہر شہبھو، شہر شہبھو

## گئے فرشتے

کہنے لگے۔ اس کے بعد جرجی مندر آتا۔ ہم چاروں یہی عمل دہراتے اور خوب  
تعبے لگاتے۔ جب کوئی پہلی آنکھیں ملتا باہر نکلتا۔ تو ہم خاموش ہو جاتے اور  
چپ چاپ چل پڑتے۔

اسی طرح تین بج گئے — ایک سڑک پر کھڑے ہو کر مسود نے رہنمائی  
کیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زبان سے میں نے کبھی ناشائستہ کلمہ نہیں  
سنا تھا۔ مگر جب وہ موٹی موٹی گالیاں اگل رہا تھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اس  
کی زبان پر ٹھیک طر پر بیٹھتی نہیں تھیں۔

چار بجے ہم زبیدہ کا بیچ پیچے اور سو گئے۔ لیکن مسود شاید جاگتا اور شکر کہتا  
رہتا تھا۔

مے نوشی کے معاملے میں بھی شعیام اعتدالی پسند نہیں تھا۔ وہ کھل کھیلے  
کا تال تھا۔ مگر اپنے سلسلے میدان کی وسعت دیکھ لیتا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی  
کو اچھی طرح جانچ لیتا تھا۔ تاکہ حدود سے آگے نکل نہ جائے وہ مجھ سے کہا کرتا  
تھا۔ میں جو کہ پسند کرتا ہوں — چھکے محض اتفاق سے لگ جاتے ہیں۔  
ایک جھکا ملاحظہ ہو:-

تقسیم ہونے سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے۔ شعیام، شاہد لطیف کے گھر  
سے میرے یہاں چلا آیا تھا۔ بیٹی کی زبان میں کوڑکی یعنی غصی کے دن تھے مگر  
نوشی بڑی ملائدگی سے جاری تھی۔ ایک شام باتوں باتوں میں زیادہ پنی گئے۔

راجہ بھدی سلی خان بھی اتفاق سے موجود تھا۔ کمریہ کا وقت ہوا تو اس نے جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے اس نے کہا: ”پاگل ہوئے ہو کپڑے جانو گے۔“  
 شام نے اس سے ازراہ مذاق کہا: ”یہیں سو جاؤ۔ آج کل تاجی یہیں نہیں ہے۔“  
 راجہ نے مسکرا کر جواب دیا: ”مجھے نیند نہیں آئے گی۔ پس رنگ والے پشتگوں پر میں قلعاً سو نہیں سکتا۔“

شام نے ایک گلاس میں راجہ کے ذیل ڈول کے مطابق برانڈی کا پگ ڈالا۔ اور اس کو دے دیا: ”یہ لو۔ اس سے نیند آ جائے گی۔“

راجہ ایک جرمے میں سارا گلاس چڑھا گیا۔ بہت دیر تک تاجی کی باتیں ہوتی رہیں۔ جو شام سے ناراض ہو کر اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔ ہر آخر میں دسویں دفعہ نکتی نکتی باتوں پر دونوں میں چھ ہو جاتی تھی۔ میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ اس لئے کہ شام گریہ بالکل پسند نہیں تھا۔ ہم دونوں میں گویا دل ہی دل میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

تاجی یوں لگی تھی جیسے کسی واپس نہیں آئے گی۔ اور شام نے بھی اٹھے یوں دواغ کیا تھا جیسے وہ پھر کبھی اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوگا۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے دور بیٹھے تڑپتے رہتے تھے۔ شاموں کو تو شام اکثر تاجی کے محلے میں بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور رات بھر اس کی یاد میں جاگتا رہے گا۔ مگر کم بخت نیند کا کچھ ایسا مانتا تھا کہ پٹنگ پر لیٹے ہی سو جاتا۔



میرے فیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک سونے کا اور دوسرا بیٹھے کا سونے والا کمرہ میں نے شام اورتا ہی کو مے دیا تھا۔ اور بیٹھے والے کمرے میں گولا بچا کر میں سنا تھا۔ تاہی جو کہ موجود نہیں تھی۔ اس لئے اس کا پتلا گولہ جہدی علی خان کو مل گیا رات بہت گزر گئی تھی۔ اس لئے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر سو گئے۔

صبح سول پانے چھ کے قریب میری جاگ کھلی۔ نیم خوابی کے عالم میں یوں غموس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بیوی ہے مگر وہ تو لاہور میں تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ شام ہے۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیسے میرے پاس پہنچ گیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ جیلے ہوئے پیرے کی بوناک میں گھسی۔ پاس ہی صوفہ پڑا تھا۔ عرصہ ہوا اس کوٹ گرنے سے اس کا ایک حصہ جل گیا تھا۔ مگر اتنی دیر کے بعد اب بڑا آنے کا کیا مطلب ہے۔ آنکھیں زیادہ کھلیں تو میں نے دھوئیں کی کڑواہٹ غموس کی اور ہلکے ہلکے دو دھویا بادل بھی دیکھے۔ اٹھ کر میں دوسرے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پتلا جس پر شام سویا کرتا تھا۔ تنگ رہا ہے اور پاس ہی دوسرے پتلا پر راجہ جہدی علی خان اپنی توہنہ نکالے پڑا خواتے لے رہا ہے۔

میں نے قریب جا کر پتلا کے جیلے ہوئے حصے کا معائنہ کیا۔ میٹریں میں بیوی رکابی کے برابر سولخ تھا۔ جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ بجھانے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ پتلا پانی میں تر بہتر تھا۔

مگر معاملہ چونکہ روٹی اور ناریل کے پھوس کا تھا۔ اس لئے ننگ پوری طرح نہیں  
 تھی اور بابر سنگ رہی تھی میں نے راجہ کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ کوٹ  
 بدل کر اور زور سے خطرے لینے لگا ایک دم پانگ کے سیاہ رخ سے  
 ایک لال لال شعلہ باہر لپکا۔ میں فوراً غصے غلنے کی طرف بھاگا ایک بالٹی  
 پانی کی اس سوراخ میں ڈالی اور جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ آگ بجھ گئی ہے  
 تو راجہ کو جنھوڑ کر گھسیٹ کر لے گیا۔ اس سے جب آتش زنگ کی وادرات کے شعلے استغناء  
 کیا تو اس نے اپنے مخصوص مزاجیہ انداز میں خوب ننگ مڑھ لگا کر واقعات بیان  
 کئے: تمہارا یہ شیام ہنومان مبارک ہے۔ رات برائڈی کے تالاب میں غوطہ  
 لگاتے ہوئے میں سو گیا دو بجے کے قریب جب عجیب عجیب آوازیں آئیں تو میں جاگ  
 پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیام ایک بہت بڑا ہنومان ہے۔ اس کی گھٹے دار دم کیساتھ  
 مٹی کے تیل میں ڈوبی چندیاں بندھی ہیں اور ان میں آگ لگی ہے شیام پانگ پر  
 زور زور سے اچھل کود رہے اور اپنی دم سے آگ لگا رہے جب آگ  
 لگ گئی تو میں نے آنکھیں بند کر لیں اور برائڈی کے تالاب میں غوطہ لگا  
 گیا۔ تھک کے ساتھ لگ کر سونے ہی والا تھا کہ مجھے تمہارا خیال آیا ہے۔ کہ  
 غریب آدمی کا چنگ الیسا زہر کہ جل کر راکھ ہو جائے۔ چنانچہ آتش شیام غائب  
 تھا۔ دوسرے کمرے میں تمہیں حالات سے آگاہ کرنے کے لئے گیا تو کیا دیکھتا  
 ہوں کہ شیام اپنے اصلی روپ میں تمہارے ساتھ چھٹ کر ایسا ہے میں نے



- میں آتشزدگی کی اس واردات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ مگر ب راجہ دوسرے کمرے سے شام کی جلی ہوئی ریشمی قمیض اٹھا کر لایا تو شام نے مجھے کہا اب تعیش کرنی ہی پڑے گی۔

سب نے مل کر تعیش کی تو معلوم ہوا کہ شام صاحب نے جبرئیل بن پنا تھا۔ وہ بھی دو ایک جگہ سے جلا بیڑا ہے۔ زیادہ گہرا میوں میں گھٹے تو دیکھا کراٹھی جھاتی پر دوپے روپے جتنے دو بڑے آٹے ہیں۔ چنانچہ شرک ہو مڑے اپنے دوست وائسن سے کہا: یہ بات تھیں طور پر پائیہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آگ ضرور لگی تھی اور شام صرف اس غرض سے کہ اس کے مسائے راجہ مہدی علی خان کو تکلیف نہ ہو۔ چپ چاپ اُٹھ کر میرے پاس چلا آیا۔

جب شام نے تہذیب و تمدن کے مروجہ قوانین کے پیش نظر تاجی سے باتا مردہ شادی کی۔ تو میرا خیال ہے۔ صرف ایک انتقامی جذبے کے تحت اس نے اتنی شاندار دعوت کی کہ دیر تک نعلی دنیا میں اس کے چرچے رہے اتنی شراب بہانی گئی کہ غم کے خم خالی ہو گئے۔ مگر افسوس کہ تہذیب و تمدن کی ستر پوش چولی کے داغ وصل نہ سکے۔

شام صرف بولی اور عورت ہی کا رسیا نہیں تھا۔ زندگی میں جتنی نعمتیں موجود ہیں۔ وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اچھی کتاب سے بھی وہ اسی طرح پیاد کرتا تھا جس طرح ایک اچھی عورت سے کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مڑ گئی تھی۔

مگر اس کی اپنی تویلیں ماں سے بھی ویسی ہی محبت تھی۔ جو حقیقی ماں سے ہو سکتی ہے اس کے چہرے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ان سب کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ باب کی موت کے بعد صرف اس کی اکیلی جان تھی جو لختہ بڑے کنبے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

ایک طرح سے بچ وہ انتہائی خلوص کے ساتھ دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ماتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس دوران میں تقدیر نے اُسے کئی بچے دیئے مگر وہ ہنستا رہا۔ جان میں ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ قمری بنیں میں ہوگی۔ اور وہ کئی برسوں کے بعد آخر آپس گیا کہ دولت اور شہرت دونوں اس کی جیب میں تھیں۔

موت سے پہلے اُس کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی بچے کے مصافات میں ایک خوبصورت بنگلہ اس کی ملکیت تھا اور کہیں وہ دن تھے کہ اس کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی۔ مگر مفلسی کے ان ایام میں بھی وہی ہنستا ہوا شیاہم تھا دولت و شہرت آئی تو اس نے ان کا یوں استقبال نہ کیا جس طرح لوگ ہوتی کشنر کا کرتے ہیں یہ دونوں مٹرائیں اس کے پاس آئیں تو اس نے ان کو اپنی ٹوہے کی چادر پائی پر بٹھالیا۔ اور چٹاخ۔ چٹاخ بوسے داغ دیے۔

میں اور وہ جب ایک چھت کے نیچے رہتے تھے تو دونوں کی حالت پتلی تھی جلم انڈسٹری ملک کی سیاست کی طرح ایک دوسرے ہی نازک دور

سے گزردہ ہی تھی۔ میں بیٹی ٹائیکو میں ملازم تھا۔ اس کاواٹاں ایک بکچر کا کنٹرول تھا۔ دس ہزار روپے میں۔ سرحد کی بیکاری کے بعد اس کو یہ کام ملا تھا۔ مگر وقت پر پیسے نہیں ملتے تھے۔ بہر حال ہم دونوں کا گندو کسی نہ کسی طور پر ہو جاتا تھا۔ میاں بیوی بہتے تو ان میں روپے پیسے کے مسئلے میں حوروں جھجھکتی۔ مگر شیم اور مجھے کبھی محسوس تک نہ ہوا کہ ہم میں سے کون خیر کر رہا ہے اور کتنا کر رہا ہے۔

ایک دن اُسے بڑی کوششوں کے بعد موتی سی رقم ملی۔ غالباً پانچ سو روپے تھے، میری جیب خالی تھی۔ ہم ملاوے مگر آ رہے تھے راستے میں شیم کا یہ پردہ گرام بن گیا کہ وہ چمچ گیت کسی دوست سے ملے جائے گا۔ میرا ایشیئن آیا۔ تو اس نے جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کی گندی کالی آنکھیں بند کر کے اس کے دو حصے کئے اور مجھ سے کہا: "جلدی کرو مٹھو۔۔۔۔۔۔ ان میں سے ایک لے لو۔"

میں نے گندی کا ایک حصہ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا اور پیٹ فارم پر آ کر گیا۔ شیم نے مجھے "تاتا" کہا اور پکڑ کر نوٹ جیب سے نکال کر لپکا۔ "تم بھی کیا یاد رکھو گی۔ سیلفی کی خاطر میں نے یہ نوٹ علیحدہ رکھ لئے تھے۔۔۔۔۔۔ ہب ٹا۔"

شام کو جب وہ اپنے دوست سے مل کر آیا۔ تو کباب ہو رہا تھا شہور فلم اسٹار کے لئے اس کو بڑیا تھا کہ وہ اس سے ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہے۔ شیم نے براہداری کی بومیں میں سے نکال کر اور گلاس میں ایک جڑا بیگ ڈال کر

مجھ سے کہا: پلاٹھیٹ بات یہ تھی..... میں نے لاہور میں ایک وفد کس سے کہا تھا کہ ”کے کے“ مجھ پر مرقی ہے۔ خدا کی قسم بہت جیسی طرح مرقی ہے۔ لیکن ان دفوں میرے دل میں کوئی گتباش نہیں تھی۔ آج اس نے مجھے اپنے گھر لاکر کہا کہ تم نے کہا اس کی تھی۔ میں تم پر کبھی نہیں مری۔ میں نے کہا تو آج مر جاؤ۔ مگر اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور مجھے غصے میں آکر اُس کے ایک گھونسہ مارنا پڑا:

میں نے اس سے پوچھا: تم نے ایک عورت پر اتنا آم آٹھایا؟  
 شمیم نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جو دھکی ہو رہا تھا: کم محبت آگے سے ہٹ گئی۔  
 نشانہ چمکا اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا گرایا:  
 یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا: سال بے کار تنگ کر رہی ہے۔

میں نے اوپر دوپے پیسے کا ذکر کیا ہے..... غالباً دو برس پیسے کی بات ہے۔ میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبلوں حالی اور اپنے افسانے..... تھنڈا گوشت کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ عدالت ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین مہینے قید با مشقت اور تین سو روپیہ جرمانے کی سزا دی تھی۔ میرا دل اس قدر کٹھا ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا۔ اپنی تمام تصانیف کو آگ میں جھینک کر کوئی اور کام شروع کر دوں۔ جس کا تخیل سے کوئی علاقہ ہو..... چنگی کے ٹکے میں ملازم سب جاؤں اور رشوت کھا کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالا کروں کس پر نکتہ چینی کروں۔ نکس سٹے میں اپنی واسٹے دوں۔

ایک عجیب و غریب دور سے میلادول دو عالم گذرنا تھا۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ افسانے لکھ کر ان پر مقدمے چلوانا میرا پیشہ ہے۔ بعض کہتے تھے کہ میں صرف اس لئے لکھتا ہوں کہ سستی شہرت کا دلدادہ ہوں اور لوگوں کے منفی جذبات شتمل کر کے اپنا الوسیدھا کرنا ہوں۔ مجھ پر چارہ مقدمے چل چکے تھے ان چارہ لڑائیوں کو یہ جاننا کہ میں جو غم میری کمر میں پیدا ہوا۔ اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی اس پاس کے ماحول نے جب ٹکٹا کر دیا تو آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سکڑ گئے۔ ایک صرف مکتبہ جدید لاہور کے چوہدری برادران تھے جو مقدمہ در میری امداد کر رہے تھے۔ غم غلبا کرنے کے لئے جب میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کی تو انہوں نے چاہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ مگر وہ اتنے غلط تھے کہ مجھے نادامن کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس زمانے میں میری کسی سے خط و کتابت نہیں تھی۔ دراصل میلادول بالکل ایسا ہرجا تھا۔ اکثر گھر سے باہر رہتا اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر بڑا رہتا جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی و روحانی خودکشی کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایک دن مجھے کسی اور کے گھر کے پتے سے ایک خط ملا۔ تعبیین پیکرز کے مالک کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا کہ میں فراموشوں۔ بیٹے سے انہیں میرے بارے میں کوئی ہدایت موصول ہوئی ہے۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ ہدایت



جیسے والا کرن ہے۔ میں تمہیں پکیزہ والوں سے بلا معلوم ہوا کہ بجئے سے شام کے پے در پے انہیں کئی تازے پی کبھے دھونڈ لکھ کر ۵۰ روپے دے دیے جائیں۔ میں جب دفتر میں پہنچا۔ تو وہ شام کے تازہ تاکید سی تار کا جواب لکھ رہے تھے کہ تلاش بسیار کے باوجود انہیں منسو نہیں مل سکا۔

میں نے ۵۰ روپے لے لئے اور میری محمود انکسوں میں اٹھوا گئے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ شام کو خط لکھ کر اس کا شکریہ ادا کروں اور پھر چل کر اس نے مجھے یہ ۵۰ روپے کیوں بھیجے تھے۔ کیا اس کو علم تھا کہ میری مالی حالت کمزور ہے۔ اس غرض سے میں نے کئی خط لکھے اور سچاڑ دیئے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ میرے لکھے ہوئے الفاظ شام کے اس جذبے کا منہ چمڑا رہے ہیں۔ جس کے ذرا اثر اس نے مجھے ۵۰ روپے روانہ کئے تھے۔

پچھلے سال جب شام اپنے ذاتی فلم کی تلاش کے سلسلے میں امرت سر آیا۔ تو تھوڑی دیر کے لئے لاہور بھی آگیا۔ جہاں اس نے بہت سے لوگوں سے میرا اتنا پتا پوچھا۔ مگر اس دوران میں اتفاق سے مجھے ہی معلوم ہو گیا کہ وہ لاہور میں موجود ہے۔ میں اسی وقت روڑا اس سینما پہنچا۔ جہاں وہ ایک دعوت کھا کے آ رہا تھا۔

میرے ساتھ رشید عطرے تھا شام کا پلہنے کا پرا نا دوست جب سوڑ سینما کے صحن میں داخل ہوئے تو شام نے مجھے اور رشید کو دیکھ لیا۔ ایک زور کا غرہ

بلند کیا۔ اُس نے ڈرائیور سے موٹر روکنے کے لئے بہت کہا۔ مگر اس کے استقبال کے لئے اس قدر ہجوم تھا کہ ڈرائیور نہڑکا۔ موٹر سے نکل کر پولیس کی مدد سے شیم اور اوسم ایک ہی قسم کا لباس اور سر پر سفید پانا مرہ بیٹ پہنے سلیک کے اندر پچھلے دروازے سے داخل ہو گئے۔ بڑے دروازے سے ہم اندر پہنچے۔ شیم .... وہی شیم تھا۔ سکراتا، بنتا اور تہقے لگاتا شیم۔

دوڑ کر ہم دونوں سے پٹ گیا۔ پھر اس قدر شور مچا کہ ہمیں سے کوئی بھی مطلب کی بات نہ کر سکا، اوپر تلے اتنی باتیں ہوئیں کہ انبار لگ گئے اور ہم ان کے نیچے دب کے رہ گئے۔ سینا سے فارغ ہو کر اُسے ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جانا تھا۔ یہیں میں اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں جب باتیں شروع ہوئی، فوراً کٹ جاتی۔ لوگ دھڑا دھڑا رہے تھے۔ نیچے بازار میں ہجوم شور برپا کر رہا تھا کہ شیم درشن دینے کے لئے باہر سلیکن میں آئے۔

شیم کی حالت عجیب و غریب تھی۔ اس کو لاہور میں اپنی موجودگی کا شدید احساس تھا۔ اس لاہور میں جس کی متعدد مشرکوں پر اس کے دومانوں کے چھینٹے بکھرا کرتے تھے۔ اس لاہور میں جس کا فاصدا اب امرتسر سے ہزاروں میل ہو گیا تھا اور اس کا راولپنڈی کہاں تھا۔ جہاں اُس نے اپنے لڑکپن کے دن گزارے تھے؟ لاہور، امرت سر اور راولپنڈی، سب اپنی اپنی جگہ پر تھے۔ مگر وہ دن نہیں تھے۔ وہ راتیں نہیں تھیں جو شیم یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ سیاست

کے گورنر نے انہیں نہ معلوم کہاں دفن کر دیا تھا۔  
شیام نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ ساتھ رہو مگر اس کے دل و دماغ کی  
مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پرانزدہ کر دیا اس سے یہ وعدہ کر کے  
کہ رات کو اس سے فیصلی مہر ق میں ملوں گا۔ چلا گیا۔

شیام سے اتنی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی مگر خوشی کے سبب اسے ایک عجیب  
قسم کی گھٹی گھٹی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ طبیعت میں اس قدر جھنجھلاہٹ تھی کہ  
جی چاہتا تھا کسی سے زبردست لڑائی ہو جائے۔ خوب بدگنائی ہو اور میں  
خٹک کر سو جاؤں۔ گھٹن کا تجزیہ کیا تو کہاں کہاں پہنچ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں  
خیالات کے سارے دھاگے بڑی طرح آپس میں الجھ گئے۔ اس سے طبیعت  
اور جی جھنجھلا گئی اور غیظ میں جا کر میں نے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھا  
شروع کر دیا۔

تو ساڑھے نو بجے کے قریب شور سننے پر معلوم ہوا کہ شیام آ گیا ہے اس کے  
کمرے میں بیٹھے والوں کی ویسی ہی بیسٹر تھی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ مگر کھل کر کوئی  
بات نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کے جذبات میں تالے لگا کر  
چابیاں کسی نے ایک ہیٹ برسے گئے ہیں پر وہی شخصیں ہم دونوں اس  
گچھے میں سے ایک ایک چابی نکال کر یہ تالے کھولنے کی کوشش کرتے اور  
ناکام رہتے تھے۔

## مٹری کی دمن

میں اکتا گیا۔ ڈنر کے بعد شیا م نے بڑی جذباتی قسم کی تقریر کی مگر میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ سنا۔ میرا چاندماغ بڑے اُدھے سروں میں جانے گیا۔ یک دم رٹا تھا۔ شیا م نے اپنی جگہ اس ختم کی تو لوگوں نے بھرے پیٹ کے ساتھ تالیاں پیشیں۔ میں اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ وہاں فضل بیٹھے تھے۔ ان سے ایک معمولی بات پر جھج ہو گئی۔ شیا م آیا تو اُس نے کہا: یہ سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں چلو آؤ تم بھی چلو۔

میں قریب قریب رو دیا۔ میں نہیں جاتا۔ تم جاؤ اور تمہارے یہ لوگ جائیں۔  
”تو میرا انتظار کرو..... میں اسی آیا۔“

یہ کہہ کر شیا م ہیرا منڈی جانے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شیا م کو اور علمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو موٹ موٹ گالیاں دیں اور فضل سے کہا: میرا خیال ہے۔ آپ تو یہاں انتظار کریں گے اگر تکلیف نہ ہو تو اندازہ کر م اپنی موڑ میں مجھے میرے گھر تک چھوڑ آئیے۔

رات بھر اوٹ چٹانگ خواب دیکھتا رہا۔ شیا م سے کئی مرتبہ لڑائی ہوئی صبح دو دوہ والا آیا تو میں کھوکھلے غصے میں اُس سے کہہ رہا تھا: تم بالکل بدل گئے ہو..... اُن کو کچھ پتہ ہے، کہنے، ذلیل..... تم بندو سہو۔

غیند کھلی تو میں نے عسوس کیا کہ میرے منہ سے ایک بہت بڑی گالی نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اچھی طرح مشورہ۔ تو یقین ہو گیا کہ وہ میرا منہ

نہیں تھا۔ سیاست کا بھونپنا تھا۔ جس سے یہ گالی بھی تھی اس کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے دو دھ والے سے دودھ لیا جس میں ایک چوڑھائی پانی تھا۔ اس خیال نے مجھے بڑی ڈھارس دی کہ شیام ہندو تھا مگر پانی ملا ہندو نہیں تھا۔

عرصہ ہوا جب تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خونریز جنگ جاری تھی اور طرفین کے ہزاروں آدمی روزانہ مرتے۔ تھے شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے اس کے افراد اپنے تازہ زخموں کی کُودار سنا رہے تھے جو بہت ہی دردناک تھی۔ شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا وہ پھل جو اس کے دل و دماغ میں دھج رہی تھی اس کو بھی میں بخوبی سمجھتا تھا۔ جب ہم دونوں سے رخصت ہوئے تو میں نے شیام سے کہا: ”میں مسلمان ہوں کیا تمہارا بھی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو؟“

شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: ”اس وقت نہیں..... لیکن اس وقت جبکہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا۔..... میں تمہیں قتل کر سکتا تھا۔“

شیام کے منہ سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکا لگا۔ اس وقت شاید میں ہی اسے قتل کر سکتا۔ مگر بعد میں جب میں نے سوچا اور اس وقت اور اس وقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیا۔ تو ان تمام فسادات کا تفسیاتی پس منظر میری سمجھ میں آ گیا۔ جس میں روزانہ سینکڑوں بے گناہ ہندو اور مسلمان

موت کے گھٹا امارے جارہے تھے۔

اس وقت نہیں... اس وقت ٹل... کیوں؟ آپ سوچئے تو آپ کو اس کوں کے پیچھے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائے گا۔

بیمٹی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ بجٹے ٹائیز کی عنان حکومت جب اشوک اودوا چالے سنبھالی تو بڑے بڑے عہدے اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس سے بجٹے ٹائیز کے ہندو اشراف میں نفرت اور عصبیت کی لہر دوڑ گئی، واپا کو گناہم خط موصول ہوئے گئے جس میں اسٹوڈنٹس کو آگ لگانے اور مرنے مرنے کی دھمکیاں ہوتی تھیں، اشوک اور واپا دونوں کو ان کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن کچھ ذکی المحس ہونے کے باعث اوپر کچھ مسلمان چوہنے کی وجہ سے میں حالات کی نزاکت کو بہت زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اشوک اودوا پاس اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اور ان کو راستے دی کہ وہ مجھے بجے ٹائیز سے الگ کر دیں۔ کیونکہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ صرف میری وجہ سے مسلمان وٹن داخل ہو رہے ہیں مگر انہوں نے کہا کہ میرا داغ خراب ہے۔

داغ میرا واقعی خراب ہو رہا تھا۔ سیوی جے پاکستان میں تھے۔ جب وہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا تو میں اُسے جانتا تھا اس میں وقتاً فوقتاً جو ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ میں ان سے بھی واقف تھا۔ مگر اب اس

خطۂ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا اس کا مجھے علم نہیں تھا اپنی حکومت کیا  
 بہرتی ہے؟ اس کی تصویر بھی کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔  
 ۱۴ اگست کا دن میرے سامنے بجے میں منایا گیا۔ پاکستان اور عبادت  
 دونوں آزاد ملک قرار دیئے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور تھے مگر قتل اور آگ  
 کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زعمہ ہاد کے ساتھ ساتھ  
 پاکستان زعمہ ہاد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگریس کے ترنگے کے ساتھ اسلامی  
 پرچم بھی لہراتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور قائد اعظم محمد علی جناح دونوں  
 کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گرجتے تھے۔ سبھی میں نہیں آتا تھا۔ کہ  
 ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی  
 بے پردی سے بھایا جا رہا ہے۔ وہ بڑیاں کہاں جلائی یا دفن کی جاتیں گی  
 جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چلیں اور گدھ فوج فوج کر کھائے تھے  
 اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں، ہمارا غلام کون ہو گا۔۔۔۔۔ جب غلام تھے تو آزادی  
 کا تصور کر سکتے تھے اب آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصور کیا ہو گا لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد  
 بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑا مڑ رہے تھے کیسے مڑ رہے تھے، کہیں  
 مڑ رہے تھے۔۔۔۔۔ ان سوالوں کے مختلف جواب تھے، عبادتی جواب پاکستانی  
 جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا مگر اس جواب میں  
 حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی

کہتا اسے ہندو کے کھنڈرات میں تلاش کرو کوئی کہتا نہیں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لئے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور تاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور لہوا اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے۔ جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔

ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا لیکن انسان ان دونوں ملکوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام..... مذہبی جنون کا غلام۔ حیوانیت و بربریت کا غلام.....

میں نے بچے ٹاکیز جانا چھوڑ دیا۔ اشوک اور واپا آتے تو میں خرابی طبیعت کا مباد کر دیتا۔ اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔ ششیام مجھے دیکھتا اور سکا دیتا اس کو میری قلبی کیفیت کا بخوبی علم تھا کچھ دن بیت زیادہ پی کر میں نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن گرم صوفے پر لیٹا رہتا۔ ایک دن ششیام سٹوڈیو سے آیا۔ تو اس نے مجھے لیٹا دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا: کیوں خواجہ جنگلی کر رہے ہو؟

مجھے بہت جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ ششیام میری طرح کیوں نہیں سوچتا اس کے دل و دماغ میں وہ طوفان کیوں برپا نہیں ہیں جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔ وہ اسی طرح مسکراتا، ہنستا اور شور مچاتا رہتا۔ مگر



شاید وہ اس نیچے پر پہنچ چکا تھا کہ جو فضا اس وقت گرد و پیش تھی اس میں سوچنا بالکل بے کار ہے۔

میں نے بہت غور فکر کیا۔ مگر کچھ بھی نہ آیا۔ آخر تنگ آکر میں نے ہٹا دیلیں یہاں سے۔۔۔۔۔ شایم کی ٹاٹ ٹوٹ گئی تھی میں نے اپنا اسباب وغیرہ باندھنا شروع کر دیا۔ ساری رات اسی میں گزر گئی جب برقی تو شایم ٹوٹ گئی سے فارغ ہو کر آیا۔ اس نے میرا بندھا ہوا اسباب دیکھا تو مجھ سے صرف آنا پوچھا پیسے؟ میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا: ہاں۔

اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان "ہجرت" کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ بقایا سامان رکھوانے میں اس نے میرا ہاتھ بٹایا اس دوران میں رات کی ٹوٹ گئی کے بیٹھے بیان کرتا رہا۔ اور خوب ہنستا رہا۔ جب میرے نصحت ہونے کا وقت آیا تو اس نے الماری میں سے برائڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیسے بنائے اور ایک مجھے دے کر کہا: ہپ ٹلا!

میں نے جواب میں ہپ ٹلا کہا اور اس نے قیمتی لگاتے ہوئے مجھے اپنے چوڑے سینے کے ساتھ سینچ لیا: سر کہیں کے؟ میں نے اپنے آنسو روکے: پاکستان کے؟

شایم نے پُر غلوس نعرہ بلند کیا: "زندہ باد پاکستان!" "زندہ باد تجارت" اور میں نیچے چلا گیا۔ جہاں ٹوک والا میرا انتظار کر رہا تھا۔

بندر گاہ تک شیم میرے ساتھ گیا۔ جہاں پہنچنے میں کافی دیر تھی۔ وہ ادھر ادھر کے پٹیفے سن کر میرا دل بہلا تا رہا۔ جب وصل ہوا تو اس نے ہپ ٹکا کر کر میرا ہاتھ دیا۔ اورو گینگ وے سے نیچے اتر گیا..... ٹھوکر اس نے میری طرف نہ دیکھا اور مضبوط قدم اٹھاتا بندر گاہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے لاہور پہنچ کر اس کو خط لکھا۔ انیس ایک اڑتالیس کو اس کا جواب آیا یہاں تمہیں سب لوگ یاد کرتے ہیں۔ تمہاری اور تمہاری بذراستی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہیں۔ جو تم بڑی فراخ دلی سے اُن پر صانع کرتے تھے واپس آجائیں تاکہ اس بات پر متصر ہے کہ تم کئی کئی گئے اب کی دفعہ اس کو اطلاع دیتے بغیر پاکستان بھاگ کر گئے عجیب تنناقض بات ہے کہ وہ جو بچے مائیز میں مسلمانوں کے دامن کی مخالفت میں سب سے آگے حساب سے پہلا آدمی تھا جو پاکستان بھاگ کر چلا گیا خود کو اپنے نظریے کا شہید بناتے ہوئے... یہ واپس آنا نظریہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اُس کو ضرور خط لکھا ہو گا۔ اگر نہیں لکھا تو فردا کھو کم از کم شرافت کا یہی تقاضا ہے۔

تمہارا شیم

آج چودہ اگست ہے وہ دن جب پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے ہیں  
 ادھر ادھر آدمروؤں کی طرف خوشیاں منائی جا رہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حملے اور  
 دفاع کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ شورشِ جہاد میں..... میں شہداء کی روح سے غالب  
 ہوتا ہوں۔ پیارے شہداء! مجھے ناکیز چھوڑ کر چلا گیا تھا کیا پتہ تیرا ہلالِ نہر  
 کثیر نہیں چھوڑے تھے..... ہے تابِ تلاءِ بابت؟

---

## پری چہرہ نسیم بانو

میرا فلم دیکھنے کا شوق امرتسری میں ختم ہو چکا تھا اس قدر فلم دیکھے تھے کہ اب ان میں میرے لئے کشش ہی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب میں ہفتہ وار ”مسعود“ کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں بیٹھ بیٹھا تو مہینوں کسی سینما کا رخ نہ کیا۔ پرچہ فلمی تھا۔ ہر فلم کا پاس مل سکتا تھا۔ مگر طبیعت ادھر راغب نہ تھی بجٹے بجٹے ٹائیکز کا ایک فلم ”اچھوت کینا“ ان دنوں ایک سینما میں ہفتوں سے چل رہا تھا جب اس کی نمائش کا بائیسواں ہفتہ شروع ہوا۔ تو میں نے سوچا اس فلم میں کیا ہے جو اتنی دیر سے چل رہا ہے۔ دیکھنا چاہیے۔

بمبئی میں یہ میل پہلا فلم تھا میں نے اس میں پہلی مرتبہ اشوک کمار دیوکارانی کو دیکھا اشوک کمار کا ایک ”شگ خام نغا“ مگر دیوکارانی کا کام بہت مضبوط تھا فلم

بمجموعی طور پر کامیاب تھا ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس میں سوتیلانہ پن نہیں تھا۔ ایک سیدھی سادی کہانی تھی جو بڑے صاف ستھرے انداز میں پیش کی گئی تھی میں نے اب گاہے گاہے فلم دیکھنے شروع کر دیئے۔

ان دنوں ایکٹرسوں میں ایک ایکٹرس نسیم بانو خاص مشہور تھی۔ اس کی خوبصورتی کا سبب چچا تھا اشتہاروں میں اسے پری چہرہ نسیم کہا جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہی اخبار میں اس کے کئی فوٹو دیکھے تھے، خوش شکل تھی۔ جوان تھی۔ خاص طور پر آنکھیں بڑی پرکشش تھیں اور جب آنکھیں پرکشش ہیں تو سارا چہرہ پرکشش بن جاتا ہے۔

نسیم کے غالباً دو فلم تیار ہو چکے تھے جو سہراب مودی نے بنائے تھے اور عوام میں کافی مقبول ہوتے تھے یہ فلم میں نہیں دیکھ سکا معلوم نہیں کیوں؟ عرصہ گزر گیا اب مزو مودی ٹون کی طرف سے اس کے شاندار تاریخی فلم "پکار" کا اشتہار بڑے ذور و دل پر ہر جگہ تھا۔ پری چہرہ نسیم اس میں خود جہاں کے وہاب میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور سہراب مودی خود اس میں ایک بڑا اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

فلم کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوا۔ اس دوران میں اخباروں اور رسالوں میں "اسٹل" شائع ہوتے بڑے شاندار تھے۔ نسیم، خود جہاں کے لباس فائضہ میں بڑی پُر وقار دکھائی دیتی تھی۔

”پکار“ کی نمائش غلطی پر میں مدعو تھا۔ جہانگیر کے عدل و انصاف کا ایک من گھڑت قصہ تھا۔ جو برصے جذباتی اور تھیشری انداز میں پیش کیا گیا تھا فلم میں دو باتوں پر بہت زور تھا۔ مکالموں پر اور مہوسات پر۔ مکالمے تو غیر فطری اور تھیشری تھے لیکن بہت زور دار اور پُر شکوہ تھے جو سننے والوں پر اثر انداز ہوتے تھے چونکہ ایسا فلم اس سے پہلے نہیں بنا تھا اس لئے سہرا ب مودی کا ”پکار“ سونے کی کان ثابت ہونے کے علاوہ ہندوستانی صفت فلم سازی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

نسیم کی اداکاری کمزور تھی۔ لیکن اس کمزوری کو اس کے خدا داد حسن اور نور جہاں کے لباس نے جو اس پر خوب سمجنا تھا اپنے اندر چھپا لیا تھا مجھے یاد نہیں رہا۔ خیال ہے کہ ”پکار“ کے بعد نسیم غالباً دو تین فلموں میں پیش ہوئی مگر یہ فلم کامیابی کے لحاظ سے ”پکار“ کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس دوران میں نسیم کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیل ہی تھیں فلمی دنیا میں اس کیینڈل عام ہوتے ہیں۔ کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ سہرا ب مودی نسیم بانو سے شادی کرنے والا ہے۔ کبھی اعبادوں میں یہ خبر شائع ہوئی تھی۔ کہ نظام حیدر آباد کے صاحبزادے منظم جاہ صاحب نسیم بانو پر ڈوبے ڈال رہے ہیں اور منقریب اسے لے اڑیں گے۔ یہ خبر درست تھی کیونکہ شہزادے کا قیام ان دنوں اکشر بمبئی میں ہوتا تھا اور وہ کئی بار نسیم کے مکان واقع میرن ڈرائیو دیکھے گئے تھے۔

شہزادے نے لاکھوں روپے خرچ کئے بعد میں جن کا حساب دینے کے سلسلے میں انہیں بڑی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ آپ روپے کے ذریعے نسیم کی والدہ شمشاد عرف چھیاں کو رخصت کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ پوری چہرہ نسیم کا انتقال خرید کر آپ اسے اُس کی والدہ سمیت حیدرآباد لے گئے۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد جہاں دیدہ چھیاں نے یہ محسوس کیا کہ حیدرآباد ایک قید خانہ ہے۔ جس میں اس کی بچی کا دم گھٹا رہتا ہے آرام و آسائش کے تمام سامان موجود تھے مگر فضا میں گھٹن سی تھی۔ پھر کیا پتا تھا کہ شہزادے کی لاابالی طبیعت میں ایسا کیسا انقلاب آجاتا اور نسیم باغوادھر کی رہتی شاد دھڑکی چنانچہ چھیاں نے حکمت عملی سے کام لیا۔ حیدرآباد سے نکلتا بہت مشکل تھا مگر وہ اپنی بچی نسیم کے ساتھ واپس نہیں آنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس کی آمد پر کافی شور مچا۔ جڑی پوسٹر بازی ہوئی۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک شہزادہ منظم جاہ کے کارڈیوں کی۔ دوسری نسیم باغ کے ہمدردوں کی بہت دیر تک کیپڑا اچھال گئی اس کے بعد یہ معاملہ خاموش ہو گیا۔

میں اب نعلی دنیا میں داخل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر منشی کی حیثیت سے اسپرین قلم کھینچنے میں کام کیا۔ اینٹی ڈاکٹروں کے حکم کے مطابق اتنی سیدھی زبان میں نملوں کے مکالمے لکھتا رہا۔ ساتھ روپے ماہوار پر ترقی کی توہند وستان سننے لگوں

ہدی چہرہ نسیم بانو

میں سیٹھ نانو بھائی ڈیساٹی کے یہاں سودو چے ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ یہاں میں نے اپنی پہلی فلمی کہانی "شہ کے عنوان سے لکھی اس کا حرف "اپنی نگاریا" تھا کہنا یہ ہے کہ فلمی طبقے اب میرے نام سے واقف ہو چکے تھے۔

اس دوران میں ایک اعلان نظروں سے گزرا کہ کوئی صاحب احسان ہیں انہوں نے ایک فلم کہنی تاج پکچرز کے نام سے قائم کی ہے پہلا فلم "اجالا" ہو گا جس کی بیروغن پری چہرہ نسیم بانو ہے۔

اس فلم کے بنانے والوں میں دو مشہور ہستیاں ہیں۔ "پکار" کا مصنف کمال امروہی اور پکار ہی کا پبلسٹی مینجرا ایم اے مفتی۔ فلم کی تیاری کے دوران میں کئی جھگڑے کھڑے ہوئے۔ امیر حیدر کمال امروہی اور ایم اے مفتی کی کئی بار آپس میں بحث ہوئی۔ یہ دونوں حضرات غالباً عدالت تک بھی پہنچے مگر اجالا انجام کار مکمل ہو ہی گیا۔

کہانی معمولی تھی۔ موسیقی کمزور تھی۔ ڈائریکشن میں کوئی دم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ فلم کامیاب نہ ہو اور احسان صاحب کو کافی خسارہ اٹھانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑا۔

مگر اس کاروبار میں وہ اپنا دل نسیم بانو کو دے بیٹھے احسان صاحب کے لئے نسیم اجنبی نہیں تھی۔ ان کے والد خان بہادر محمد سلیمان چیف ایجنٹر نسیم کی والدہ عرف چھیاں کے پرستار تھے۔ بلکریں کیٹے کہ ایک لحاظ سے وہ ان کی دوسری بیوی



تھی۔ احسان صاحب کو یقیناً نسیم سے ملنے کا اتفاق ہوا ہو گا۔ غلم کی تیاری کے دوران میں تو خیر وہ نسیم کے باہل قریب رہے تھے مکن لوگوں کا بیان ہے کہ احسان اپنی چھینپواؤں شریلی طبیعت کے باعث نسیم سے پوری طرح کھل نہیں سکے تھے۔ سیت پرانے کو غلام مرش ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔ نسیم سے بہت کم بات کرتے۔ کچھ بھی ہوا آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے کیوں کہ ایک دن بہنے سنا کہ پری چہرہ نسیم نے مرزا احسان سے وائی میں شادی کرنی ہے اور یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اب غلوں میں کام نہیں کرے گی۔

نسیم بانو کے پرستاروں کے لئے یہ خبر بڑی انوس ناک تھی۔ اس کے حس کا جلوہ کیونکہ صرف ایک آدمی کے لئے وقف ہو گیا تھا۔

احسان اور نسیم کا عشق تمام مراحل طے کر کے شادی کی منزل تک کیسے پہنچا مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اشوک کمار کا بیان بہت دلچسپ ہے اشوک ایک صاحب کیپٹن صدیقی کا دوست تھا۔ یہ مرزا احسان کے قریبی عزیز تھے "اجالا" میں انہوں نے کافی روپیہ لگایا تھا۔

اشوک قریب قریب ہر روز کیپٹن صدیقی کے یہاں جایا کرتا تھا کچھ دنوں سے وہ موسیٰ کو رہا تھا کہ کیپٹن صاحب کے گھر کی فضا بدلی ہوئی ہے شروع شروع میں تو وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ لیکن ایک اس کی ناک نے موسیٰ کیا کہ ہوا میں بہت ہی عمدہ سینٹ کی خوشبو پس ہوئی ہے۔ اشوک نے اندازہ مذاق کیپٹن صدیقی سے

اس خوشبو کے ماخذ کے بارے میں پوچھا لیکن وہ گول کر گئے:

ایک دن جب اشوک، صدیق صاحب کے گھر گیا۔ تو وہ موجود نہیں تھے لیکن وہ خوشبو موجود تھی۔ جڑی لطیف لیکن جڑی شریہ۔ اشوک نے سوئنگہ سونگہ کرناک کے قدیلے سے معلوم کر لیا کہ یہ اوپر کی منزل سے آرہی ہے۔ سیڑھیاں ملے کہے وہ اوپر چنپا بکری کے کواڑ تھوڑے سے کھلے تھے۔ اشوک نے جھانک کر دیکھا نسیم بانو پلنگ پر لیٹی تھی اور اس کے پہلو میں ایک صاحب بیٹھے اس سے ہلے ہلے باتیں کر رہے تھے۔ اشوک نے پہچان لیا۔ مہر احسان تھے جن سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔

اشوک نے جب کیپٹن صدیقی سے اس معاملے کے متعلق بات کی تو وہ مسکرائے یہ سلسلہ دیر سے جاری ہے؟

اشوک کے اس بیان سے نسیم اور احسان کے اس عاشقے کا جو روشنی پڑتی ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ عشق و محبت میں جو کچھ ہوتا ہے ہوا ہو گا بجے اتنا علم ہے کہ احسان کی والدہ اور بہنیں سنت خلاف تھیں کہ وہ نسیم سے شادی کرے چنانچہ اس سلسلے میں بہت جھگڑے ہوئے۔ مگر خان بہادر محمد سلیمان صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لئے یہ شادی عمل میں آگئی اور نسیم غلمی دنیا سے دور دلی میں رہنے لگی۔ جہاں اس نے اپنے بچپن کے دن گزارے تھے۔

شادی پر اور شادی کے بعد کچھ دیر اخباروں میں ہنگامہ ڈاگر پھر نسیم غلمی

حلقوں سے اوجھل ہو گئی۔

اس دوران میں فلمی دنیا میں کئی انقلاب آئے کئی فلم کمپنیاں بنیں۔ کئی ٹوٹیں۔ کئی نئے سہے اُبھرے۔ کئی ڈوبے۔ ہانسو رائے کی انڈسٹریک موت کے بعد بیٹی ٹائیز میں طوائف الملوک جیسے ہوتی تھی دیوکارانی (منتر ہانسو رائے) اور رائے بہادر چرنی دل (جنرل منیجر) نہیں بات بات پر چلتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رائے بہادر اپنے گروپ کے ساتھ بیٹی ٹائیز سے علیحدہ ہو گئے۔ اس گروپ میں پروڈیوسر ایس مکر جی افسانہ نگار اور ڈائریکٹر گیان کرجی، مشہور ہیرا شوک کمار کو سی پروڈیوسر سائمنڈریک انڈسٹری ایس دیا چاکا میڈین دی یارچ ڈیوانی، نگار شاہ، بلینڈر سنسٹریک تھے۔ بیٹی ٹائیز سے ملتے ہی اس گروپ نے ایک نئی فلم کمپنی "ملتان" کے نام سے قائم کی۔ پروڈکشن کنٹرولر ایس مکر جی مقرب ہوئے۔ جو سلسلہ جو بلی فلم بن کر مہبت شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کہانی و ڈانی کمزور تھی۔ اسٹوڈیونٹے سادو سامان سے آراستہ ہو گئے۔ سب ٹھیک تھا مگر پروڈیوسر ایس مکر جی سخت پریشان تھے۔ بجے ٹائیز سے علیحدہ ہو کر وہ دیوکارانی کو خریدنے کے لئے کوئی سنی سیلانی والی بات پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہ بات سیروئن کے انتخاب کے متعلق تھی۔۔۔

میسٹر بیٹھے ایک دن ایس مکر جی کو یہ سوچھی کر نیم ہانوکو داپس کھینچ کر لایا جلتے یہ وہ زمانہ تھا جب اُسے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا بے مدد پے کئی کامزائیوں کے بعد اس کو یہ عرصوں ہونے لگا تھا کہ وہ جی کام میں آتے تھے ڈالے گا پورا کر لے گا چنانچہ

خود ہی نسیم بانو تک پہنچنے کے راستے سوچنے لگے۔

اشوک کی وجہ سے ایس کمری کے بھی کیشن حدیق سے برصے اچھے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ لال بہادر چوٹی لال کے احسان کے والد خان بہادر محمد سیوان سے بہت بے تکلف مراسم تھے، چنانچہ دلی میں نسیم تک رسائی حاصل کرنے میں ایس کمری کو کئی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن سب سے بڑا مرحلہ پہلے احسان کو اور پھر نسیم کو رضا مند کرنا پڑا تھا۔

کمری کی خود اعتمادی کام آئی۔ احسان نے پہلے تو صاف جواب دے دیا لیکن آخر کار رضا مند ہو گیا۔ قلع مند پر کہ جب وہ واپس بیٹھ آیا تو اخباروں میں یہ خبر برصے خات سے شائع ہوئی کہ "کرہستان کے پہلے فلم جس میں برصے نوجوان" کی ہیروئن ہدی چہرہ نسیم بانو ہوگی۔ فلمی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی کیونکہ نسیم فلمی دنیا سے ہمیشہ کے لئے علیحدگی اختیار کر چکی تھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں ڈیڑھ برس ال انڈیا ریڈیو دلی کے ساتھ منسلک رہ کر واپس بیٹھ آیا تھا۔ اور سید شاکت حسین رضوی کے ساتھ ایک کہان کہنے میں مصروف تھا۔

یہ کہانی لکھی گئی۔ چنانچہ کہانیاں بھی لکھی گئیں اس دوران میں گھر سے بھینا بہت کم ہوتا تھا۔ میری بیوی میرے اس گھر پونے سے تنگ آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں بیل اپنی صحت خواب گردانا ہوں۔

شاہد لطیف سے میرے مراسم علی گڑھ یونیورسٹی سے چلے آ رہے تھے فلستان کے کاموں سے جب بھی فراغت ملتی میرے یہاں ضرور آنا ایک دن آیا تو میری بیوی نے اس سے کہا: شاہد بھائی ان سے کچھ کہیں ملازمت کریں گھر بیٹھ کر ان کا کام مجھے اچھا نہیں لگتا۔ صحت خراب کر رہے ہیں کہیں ملازمت کریں تو گھر سے باہر تو قدم رکھا کریں گے۔

چند روز کے بعد ملاوٹ سے شاہد لطیف کا فون آیا کہ پروڈیو سرائس مگر مجھ سے انسٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ سیر پروڈیو پارٹمنٹ کے لئے انہیں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔

ملازمت کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی صرف انسٹرویو دیکھنے کے لئے میں فلستان چلا یا گیا۔ نصائحی اپنی تھی جیسے کسی یونیورسٹی کی اس نے مجھے بہت متاثر کیا مگر جی سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے بے حد پسند آئے چنانچہ وہیں کنسٹرکٹ پر دستخط کر دیئے۔ بتخواہ بہت تھوڑی تھی۔ کل تین سو روپے ماہوار اور نامہ صلیب کافی تھا۔ ایکٹرک ٹرین سے ایک گھنٹہ کے قریب گھٹا تھا، مگر وہ گاؤں پہنچنے میں لیکن میں نے سوچا ٹیک ہے۔ بتخواہ تھوڑی ہے لیکن میں ادھر ادھر سے کالیا کروں گا۔

شروع شروع میں تو فلستان میں میری حالت اجنبی کی سی تھی لیکن بہت جلد میں اسٹاف کے ساتھ گھل مل گیا۔ ایس مگر جی سے تو میرے تعلقات دوستانہ اور ایک پہنچ گئے تھے۔

## ہمدردی

اس دوران میں نسیم بانو کی صرف چند جھلکیاں دیکھنے کا اتفاق ہوا چونکہ نسیم بڑھاپا جاتا تھا اس لئے وہ چند لمحات کے لئے حوض میں آتی اور وہاں پہلی عباتی تھی۔

ایس کمری بڑا مشکل پسند واقع ہوا ہے مبینہ کہانی کی لوک پبلک درست کرنے میں لگ گئے خدا خدا کر کے نظم کی شونگ شروع ہوئی مگر یہ وہ سین تھے جن میں نسیم بانو نہیں تھی۔ بالآخر اس سے ایک روز ملاقات ہوئی۔ اسٹوڈیو کے باہر فولڈنگ کرسی پر بیٹھی تھی ناہنگ پر ناہنگ رکھے تھرموس سے چائے پی رہی تھی اشوک نے میرا اس سے تعارف کرایا۔ خندہ پیشانی سے پیش آئی اور بڑی باریک آواز میں کہا: میں نے ان کے مضامین اور افسانے چڑھے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی گفتگو ہوئی اور یہ پہلی ملاقات ختم ہوئی چونکہ وہ میک اپ میں تھی اس لئے میں اس کے اصلی حسن کا اندازہ نہ کر سکا۔ ایک بات جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی وہ یہ تھی کہ بولتے وقت اسے کوشش ہی کرنی پڑی تھی۔ جوں کیسے کہ جب وہ بولتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ تھوڑی سی مشقت کر رہی ہے۔

”پیارے کی نسیم میں اور چل چل رہے نور جہاں“ کی نسیم میں زمین و آسمان کا فرق تھا اور مردہ ملکہ نور جہاں کے لباسی فاخرہ میں ملبوس اور اور حجابات میواہ کی ایک رضا کار کی وردی میں نسیم بانو کو تین مرتبہ میک اپ کے بغیر دیکھا تو میں نے سوچا کہ انشائیں صنف کے لئے اس سے بہتر صورت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ جگہ وہ کون جہاں وہ جیتی یا کھڑی ہوتی ایک دم سوج جاتا۔

لباس کے انتخاب میں وہ بہت محتاط ہے اور رنگ پہننے کے معاملے میں جو سلیقہ اور قریظ میں نے اس کے یہاں دیکھا ہے اور کہیں نہیں دیکھا۔ زرد و رنگ بڑا خطرناک ہے کیونکہ زرد و رنگ کے کپڑے آدمی کو اکثر زرد و ترغین بنا دیتے ہیں مگر نسیم کچھ اس بے پرواہی سے یہ رنگ استعمال کرتی تھی کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔

نسیم کا محبوب لباس ساڑھی ہے، غرارہ بھی پہنتی ہے مگر گاہے گاہے شلوار قمیض پہنتی ہے۔ مگر صرف گھر میں وہ کپڑے پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس ہوس کے پرانے کپڑے کسی اچھی حالت میں موجود ہیں۔

نسیم کو میں نے بہت محنتی پایا بڑی نازک سی عادت ہے مگر سیٹ پر بار بار ڈتی رہتی ہے مگر یہی کو مسٹرن کرنا آسان کام نہیں کئی دیر سلیں کرنا پڑتی تھیں گھنٹوں جلسہ دینے والی دوستی کے سامنے اٹھ بیٹھ کر نا پڑتی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ نسیم اکتاؤ نہیں ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو اداکاری کا بہت شوق ہے ہم شوٹنگ کے ساتھ ساتھ رشتہ دیکھتے تھے۔ نسیم بانو کا کام لبس گوارا تھا اس میں چمک نہیں تھی وہ بنیادہ ادائیں کیا کر سکتی ہے اپنے مغلیہ خد و خال کی حین جھلیکوں پیش کر سکتی ہے لیکن ناقدا نہ نگاہوں کے لئے اداکاری کا جو ہر شے نہیں کر سکتی۔ لیکن پھر یہی "ہیں ہیں سے" لو جو ان میں اس کا ایکٹنگ پہنے فلموں کے مقابلے میں کچھ بہتر ہے تھا۔

مکرمی اس میں کونھلی اور دوشٹگی پیدا کرنا چاہتا ہے مگر یہ کیسے پیدا ہوتی  
 لیسیم بے حد مرد مزاج ہے۔ چنانچہ عقیدہ یہ ہوا کہ "ہل میں دے نوجوان" میں لیسیم کا  
 کو کٹر گڈ ٹر ہر کے رہ گیا۔

علم دیلینز ہوا۔ رات کو تاج میں ایک شاندار پارٹی دی گئی فلم میں لیسیم جیسی  
 بھی تھی ٹیک ہے مگر تاج میں وہ سب سے الگ نظر آتی تھی چوتھا با عظمت  
 منلیہ شہزادیوں کی مہی شان اور انفرادیت لے۔

"ہل میں دے نوجوان" کی تیاری میں دو برس۔ دو اکتا دینے والے برس  
 لگ گئے تھے جب فلم تو تمنا کے مطابق کامیاب اور مقبول نہ ہوا تو ہم سب  
 پر افسردگی طاری ہو گئی۔ مگر بہت بیدل ہوا۔ مگر کنٹرول کے مطابق چونکہ  
 اسے تاج محل پیکر کے ایک فلم کی نگرانی کرنا تھی اس لئے کر لیتے ہو کہ کام  
 شروع کرنا پڑا۔

فلم "ہل میں دے نوجوان" کی تیاری کے دوران میں احسان سے مکرمی  
 کے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے۔ جب تاج محل پیکر کے فلم کا سوال آیا تو احسان نے  
 اس کی پروڈکشن کا سارا بوجھ مکرمی کے کندھوں پر ڈال دیا۔ مکرمی نے مجھے مشورہ  
 کیا۔ آخر یہ "ہل میں دے نوجوان" کے عنوان سے میں ایک ایسی کہانی لکھوں جس میں لیسیم کی  
 خوبصورتی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاسکے۔

میں نے ایک خاکہ تیار کیا۔ مکرمی نے اس میں کچھ تبدیلیاں کرائیں جب فلم تیار



ہوا۔ تو میں نے بڑی حیرت سے یہ محسوس کیا کہ جو کہانی میں نے سوچی تھی وہ تو ردی کا فنڈوں پر ہے اور جو پردے پر چن چھوڑی ہے وہ محض اس کا ہکا ساسا ہے۔ کہانی کا قصہ چھوڑیے مجھے کہنا یہ ہے کہ ”بیگم“ کھینے کے دوران میں مجھے نسیم بانوں کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ میں اور کبری دو سپر کا کھانا ان کے گھر پر کھاتے تھے۔ اور ہر دو رات کو دیننگ کہانی میں تو نسیم کو منیج کرنے میں مصروف رہتے تھے۔

میرا خیال تھا نسیم بڑے عالی شان مکان میں رہتی ہے لیکن جب گھوڑ بند روڈ پر اس کے بنگلے میں داخل ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی بنگلہ نہایت مشکہ حالت میں تھا بڑا معمولی قسم کا فرنیچر جو غالباً کراٹے پر لایا گیا تھا ٹکسا ہوا قالین، دیو دیس اور فرش سیل زدہ۔

اس پس منظر کے ساتھ میں نے پری چہرہ نسیم بانو کو دیکھا بنگلے کے برآمدے میں وہ گوالے سے دودھ کے کوپلوں کے متعلق بات چیت کر رہی تھی۔ اس کی دلی دلی آواز، جواں لیا معلوم ہوتا تھا کہ سسٹمز کے ساتھ خلق سے نکالی جا رہی ہے گوالے سے قبول رہی تھی کہ اس نے آدھ سیر دودھ کا سیر پھر کیا ہے آدھ سیر دودھ اور پری چہرہ نسیم بانو جس کے لئے کئی فرماؤ دودھ کی نہریں نکالتے کے لئے تیار تھے..... میں چکرایا۔

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ ”پکار“ کی نود جہاں بڑی گھر پر تو قسم کی عورت ہے

پدری چہرہ نسیم بانو

اوداس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک غایت درجہ تعمیر عورت میں ہوتی ہیں۔ اُس کی یکپڑہ سینگم کی پروڈکشن شروع ہوتی ہے۔ تو مہوسات کا سد کام اُس کے سنبھال لیا۔ اٹھانہ تھا کہ دس بارہ ہزار روپے اس مد پر اٹھ جائیں گے مگر نسیم نے ددھی گھر میں بٹھا کاپنی پرانی ساڑھیوں، قمیضوں اور غزلوں سے تمام لباس تیار کروا لئے۔

نسیم کے پاس بے شمار کپڑے ہیں۔ میں اس سے قبل کہہ چکا ہوں کہ وہ لباس پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی۔ اُس پر ہر لباس سبنا ہے یہی وجہ ہے کہ سینگم میں ایس کمری نے اس کو کشمیر کے دیہات کی انٹریڈ کی کے روپ میں پیش کیا اس کو تلو تلو پٹرو بنایا۔ ہیرا کلبا کرتے اود لا چا پہننا یا موڈن لباس میں بھی پیش کیا۔

یقین وائق تھا کہ صرف مہوسات کے تنوع ہی کے باعث سینگم بے حد مقبول ثابت ہوگی۔ مگر افسوس کہ کچھ فاعر کشن اود کمزور میزک کی وجہ سے اُس نے درمیانے درجے فلموں کی بزنس کی۔

ہم سب نے اس فلم کی تیاری پر بہت محنت کی تھی۔ خاص طور پر کمری نے ہم سب دیر تک (یعنی اوقات صاف کے تین تین بجے تک) بیٹھے کام کرتے رہتے ہیں۔ اود کمری کہانی کی لوک پلک درست کرتے دیتے اور نسیم اور احسان جاگنے کی کوشش کرتے رہتے۔ جب تک احسان صاحب کی ٹانگ جھج رہتی وہ میری اود کمری کی باتیں سنتے رہتے لیکن جو نہیں ان کی ٹانگ ہنا بند ہو جاتی ہم سب سمجھ جاتے

کردہ گہری تیند سو گئے ہیں۔

نسیم کو اس سے بڑی جینلاہٹ ہوتی تھی کہ اس کا شوہر تیند کا ایسا ماتا ہے کہ کہانی کے نہایت ہی دشوار گزار موڑ پر لمبی تان کر سو جاتا تھا میں اور مگر جی احسان کو چیر مرنے تھے تو نسیم بہت تجزئہ جڑ ہوتی تھی وہ ان کو اپنی طرف سے جھنجھوڑ کر گجاتی تھی گویا اسلوم پر تاکہ لوری دے کر انہیں اور گہری تیند سلا رہی ہے۔

جب نسیم کی آنکھیں بھی منہ نے گھٹیں تو کربہ رخصت چاہتے اور چلے جاتے۔ میرا مگر گھوڑ بندہ سے بہت دور تھا۔ برقی ترین قریب قریب پلون گھسنے میں مجھے وہاں پہنچانی تھی۔ ہر روز نصف شب کے بعد مگر پہنچتا ایک اچھا خاصا خاں صاحبہاں نے جب اس کا ذکر مگر ہی سے کیا تو یہ طے ہوا کہ میں کچھ طے کے لئے نسیم ہی کے یہاں آٹھا آؤں۔

احسان بے حد جھنجھو ہیں۔ کوئی بات کہنا بہت بوسوں لگا دیتے ہیں۔ انہیں میری آسائش کا خیال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جس چیز کی مجھے ضرورت ہو میں ان سے بلا تکلف کہہ دیا کروں۔ مگر تکلف کی یہ حد تھی کہ وہ صرف بد حال زبان پر لای نہیں پاتے تھے۔ آخر ایک روز ان کے اصلا پر نسیم نے مجھ سے کہا: تمہاںوں جس چیز کی ضرورت ہو وہ دے دیا کرو۔

نسیم فٹ کاس پہنا بی بوتی تھی "ہیں چل دے تو جوان" کے زمانے میں جب میں نے رفیق غزنوی سے جو اس پتھر میں ایک اہم دہل ادا کر دیا تھا۔ ذکر کیا کہ نسیم

پنیابی بولتی ہے تو اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا کہ تم مجھے ہر میں نے  
اُس کو یقین دلانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

ایک روز شوٹنگ کے دوران میں جب نسیم اور رفیق دونوں مروجہ تھے۔ اور  
اشوک انگریزی کے "زبان مرثہ فقرے نسیم سے کہہ اسنے کی کوشش کر رہا تھا تو  
میں نے رفیق سے پوچھا: "لے! ادھر دیکھا کسے کہتے ہیں؟"  
رفیق نے جواب دیا: "یہ کس زبان کا لفظ ہے؟"

میں نے کہا: "پنیابی زبان کا؟"۔ . . . . بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟  
رفیق نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: "میںوں معلوم نہیں۔" ادھر دیکھا  
دسے پتہ نہ۔

نسیم نے گردن میں ہکا سا خم دے کر رفیق کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پنیابی  
میں اس سے پوچھا: "سچی۔ سہانوں معلوم نہیں۔"

رفیق نے جب نسیم کے منہ سے پنیابی سنی۔ تو بقول شے وہ اپنی پشت پر ہول  
گیا۔ کلفت برے لہجہ میں اُس نے نسیم سے اُردو میں کہا: "آپ پنیابی  
جانتی ہیں؟"

نسیم نے اسی طرح مسکرا کر کہا: "جی ہاں!"

میں نسیم سے مخاطب ہوا۔ تو آپ بتائیے ادھر دیکھا کسے کا مطلب کیا ہے؟  
نسیم نے کہہ دیا: "وہ۔ . . . . وہ لباس جو گھر میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

دینق غزنوی اپنی پشتراود زیادہ مبول گیا۔

نسیم کی مائی امرت سرک کشیر تھیں۔ پنجابی زبان اس نے غالباً اسی سے سیکھی تھی اردو اس لئے بہت شست و رفت لڑتی ہے کہ وہی میں اپنی ماں کے ساتھ رہیں۔ انگریزی جانتی ہے اس لئے کہ کنزٹ میں پڑھتی تھی۔ موسیقی سے شغف رکھتی ہے اس کی تلمیم ماں ہی سے پائی۔ مگر ماں جیسا سُر ملا کھ نہ پایا۔ غلوں میں اپنے گانے خود ہی گاتی ہے مگر ان میں دس نہیں ہوتا۔ لیکن اب میں نے سنا ہے کہ اُس نے خود گانا ترک کر دیا ہے۔

نسیم کے ارد گرد ہر ایک خیرہ کن نالہ تھا آہستہ آہستہ غائب ہو گیا مجھے اُن کے بچنے کے غصے خانے میں پہلی بار نہانے کا اتفاق ہوا۔ تو مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جدید ساز و سامان سے آواز سہے گا۔ متعدد قسم کے نہانے والے ٹکے ہوں گے۔ نایاب صابن ہر گا۔ ٹب ہر گا۔ وہ تمام اوت پٹانگ چیزیں ہوں گی جو حینِ عورتیں اور ایکٹریسز اپنے محسن کی افزائش کے لئے استعمال کرتی ہیں مگر وہاں صرف ایک جست کی بات تھی۔ ایورنیم کا ایک ڈونگا اور ملاٹ کے کنزیر کا بھاری پانی کہ صابن گھستے رہو اور جھاگ پیدا نہ ہو۔

لیکن نسیم کو جب بھی دیکھو تو وہ تازہ اور ٹکری ٹکری نظرات تھی بیک اپ کرتی تھی مگر بلا... شونخ بنگلوں سے اُسے نفرت ہے۔ وہ صرف وہی رنگ استعمال کرتی ہے۔ جو اس کے مزاج کے موافق ہوں یعنی معتدل۔

بھری چہرہ نسیم ہار

عطریات سے اُس کو خوشی ہے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی خوشبو یا ت اس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ بعض سنیت تو بہت ہی قیمتی اور نایاب ہیں۔ لیلہ ایک سے ایک اعلیٰ اور بیش قیمت ہے مگر ان میں لدی پسندی نہیں ہوتی، کبھی سیرے کا ایک کلنگ سپن لیا کبھی جڑاؤ چڑیاں اور کبھی موتیوں کا کار۔

ان کا دسترخوان میں نے کبھی پُر حلق نہیں دیکھا۔ احسان کو دھمے کی شکایت رہتی ہے اور نسیم کو دھام کی۔ دونوں پر بیزاری کو شش کیا کرتے تھے۔ نسیم میری مہری پر حین لے اڑتی تھی۔ اور احسان نسیم کی پیٹ پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے دونوں میں کھانے پر قریب قریب ہر روز ایک عجیب بچکانہ قسم کی چٹ بہتی تھی دونوں کی نگاہیں جب اس دوران میں ایک دوسرے سے ٹکراتیں تو دیکھنے والوں کو صاف پتہ لگ جاتا کہ وہ محبت آشنا ہیں۔

نسیم کو جب میری بیوی نے اپنے یہاں مدعو کیا تو اُسے سالنوں میں استعمال کیا جوا لگی بہت پسند آیا کھانے کی میز پر اس نے پوچھا: یہ لگی آپ کہاں سے منگواتی ہیں؟

میری بیوی نے جواب دیا: "باقاد سے..... پولس کا لگی ہے..... عام مل ہے۔"

نسیم نے کہا: "دو ڈبے بے منگواریجے" میں نے نوکر سے کہا: "وہ فوراً پاس والے اسٹور سے جس کے ساتھ میرا صاحب چلتا ہے۔ دو ڈبے لے آیا۔"

اسی طرح وہ کئی آٹھ تین لے گئی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی :- آپ وہ گئی کا حساب تو کریجئے :-

میں نے کہا :- اس کی کیا ضرورت ہے ؟  
لیکن جب اُس نے اصرار کیا تو میں نے کہا :- کل آٹھ تین ہوتے ہیں .....  
آپ حساب کریجئے :-

نسیم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا :- آٹھ ؟ میرا خیال ہے سات تین آٹھ  
میں :- سات ہی ہوں گے :-

”ہوں گے کیا .... آپ کہتے ہیں تو آٹھ ہی ہوں گے :-“

”آپ نے بھی ہوں گے ہی کہا :-“

کافی دیر تک سات اور آٹھ کا ہیر پھیر رہا۔ نسیم کے حساب کے مطابق تین  
سات تھے اور میرے اور اسٹور والے کے حساب کے مطابق آٹھ۔ فیصلہ یوں ہی  
ہو سکتا تھا کہ ہم میں سے ایک دوسرے کا حساب مان لے مگر جب بات حساب کی  
تھی تو کون دانتا۔ آخر نسیم نے اپنے لازم سے کہا کہ خالی تین اکٹھے کرے جب یہ  
اکٹھے کر کے نسیم کے دو برویش کٹے گئے تو ان کی تعداد سات تھی نسیم نے فائنل انداز  
میں میری طرف دیکھا اور کہا :- ”گننیجئے۔ سات میں :-“

میں نے پھر کہا :- ”سات ہی ہوں گے ..... لیکن میرے حساب کے مطابق  
آٹھ ہوتے ہیں۔“

حازم نسیم سے مخاطب ہوا: جی ہاں! اُتھ ہی ہوتے ہیں۔ ایک بھنگن ے گھٹی تھی۔ میں اُن سے پانچ سو روپے ماہوار لیتا تھا، ہر مہینے اس کی پاٹی پاٹی کا حساب ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کبھی سات اور آٹھ کا ہیرہ پھیر نہ ہوا۔ میاں میری دونوں میرے کام سے مطمئن تھے۔ لیکن مسٹر احسان کسی حد تک میری تیز طبیعت سے نالاں تھے۔ مگر اس کا اظہار وہ اپنی حد سے بڑھی پُر تکلف طبیعت کے باعث جو پر کبھی نہ کر سکے۔

نظام برسرِ احسان بہت دیرل قسم کے انسان ہیں مگر اپنی بیوی کے معاملے میں بہت سخت قسم گیر واقع ہوئے ہیں۔ نسیم کو صرف خاص خاص لوگوں سے ملنے کی اجازت ہے عام ایکٹروں اور ایکٹریسوں سے نسیم کو بات چیت کی ممانعت ہے ویسے نسیم میں چھپوروں سے نفرت کرتی ہے۔ شہر و نخل برپا کرنے والی پادشہوں سے وہ غور میں دور رہتی ہے۔ ایک دفعہ اسے ایک بہت بڑے بنگلے میں صحن پر ڈرا۔

یہ بنگلہ مہرلی کا بنگلہ تھا۔ جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک "ٹریڈیشن" برکھاکے آغاز پر "ڈپارٹی" ہے۔ اسی طرح مجھے "ٹائیز" کی ایک "ٹریڈیشن" مہرلی کی رنگ پادشہ تھی۔ چونکہ فلہان کے قریب قریب تمام کارکن مجھے "ٹائیز" کے مہاجر تھے اس لئے یہ "ٹریڈیشن" یہاں بھی قائم رہی۔

ایس مگر ہی اس رنگ پادشہ کے رنگ لیزدستے، عورتوں کی کان اُن کی منق اور ہنس مکھ بیوی (اشوک کی بہن) کے سپرد تھی میں شاہد لطیف کے ڈاں بیٹھا تھا۔ شاہد کی بیوی محنت (جیتائی) اور میری بیوی (صفیر) دونوں خدا مضمون کیا باتیں کر



## گئے زشتے

رہی تھیں۔ ایک دم شور برپا ہوا۔ عصمت چنتاں نہ لے سکی وہ آگئے..... لیکن میں بھی.....“

عصمت اس بات پر اڑ گئی کہ وہ کسی کو اپنے اوپر رنگ پسینے نہیں دے گی۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کی یہ ضد کہیں دوسرا رنگ اختیار نہ کر لے۔ کیونکہ رنگ پانیٹ والے سب“ ہوئی تو سے موڑ میں تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ عصمت کا موڑ خود بخود بدل گیا۔ اور وہ چند لمحات ہی میں رنگوں میں لت پت بختی بن کر دوسری بھتیوں میں شامل ہو گئی۔ میرا اور شاہد لطیف کا حلیہ بھی وہی تھا جو ہوئی کے دوسرے بھتیوں کا تھا۔

پارٹی میں جب کچھ اور لوگ شامل ہوئے تو شاہد لطیف نے باواؤ بلند کہا۔ چلو پری چہرہ نسیم کے گھر کا رخ کرو!“

رنگوں سے مسلح گردہ گھوڑہ بند روڈ کی اوپھی نیچی مار کول لگی مسلح پر بے دخلی میں بڑے بنا مارا اور خود چاتا نسیم کے بنگلے کی طرف روانہ ہوا۔ چند منٹوں ہی میں ہم سب وہاں تھے۔ خود من کر لیسہ اور احسان باہر نکلے نسیم ہلکے رنگ کی جاکٹ کی ساڑھی میں ملبوس میک اپ کی ٹوک پلک نکالے۔ جب ہجوم کے سامنے برآمدے میں نمودار ہوئی تو شاہد نے بن کا حکم دیا۔ مگر میں نے اسے روکا۔ شہر واپس آئے ان سے کہہ کر پڑے جل آئیں۔“

نسیم سے کچھ سے تمہیں کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ ایک ادا کے ساتھ

سکرائی : یہی تھیک ہیں :

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ سہل کی پچھاریاں برس پڑیں۔ چند لمحات ہی میں پھی چہرہ نسیم بانو ایک عجیب و غریب قسم کی غرقانک چڑیل بن تبدیل ہو گئی۔ نیلے پیلے رنگوں کی تھوں میں سے جب اس کے سفید اوسر نکلیے دانت اور جڑی ہنکھیں نظر آتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ بے زوا اور مافی کی معصومی پر کسی بچنے سیاہی اٹیل دی ہے۔

رنگ بازی ختم ہونے پر کبھی شروع ہوئی۔ پہلے مردوں کا پیچ شروع ہوا۔ پھر عورتوں کا یہ سب دلچسپ تھا۔ مشرکری کی فریبیری جب بھی گرتی۔ تہتہوں کا طوفان برپا ہو جاتا۔ میری بیوی جینک پوش تھی۔ شیشے رنگ اور ہونے کے باعث اسے بہت کم نظر آتا تھا۔ چنانچہ وہ اکثر غلط سمت دوڑنے لگتی۔ نسیم سے سب گاہیں جاتا تھا یا وہ یہاں کرنا ہستی تھی کہ وہ اس شقت کی خالی میں بہاں وہ پراکھیں میں دلچسپی رہی۔

نسیم اور اس کے میاں بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ میرا مطلب اس قسم کے مذہبی آدمیوں سے ہے۔ جوارو کے اعتباروں کے پڑے زمین سے اٹھا کر جوڑتے ہیں اور سر آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ شام کو ایک ستارہ دیکھتے ہیں۔ نو اور دو دیکھنے کے لئے سارا آسمان کشتا شروع کر دیتے ہیں دونوں دہم پرست ہیں۔ خاص طور پر میاں احسان دیکھ کر کس پران کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ پاس بہت اچھی تپ ہے۔ قریب ہے کہ اس پر دوپہ لگا دیں کہ ایک کا نا آدمی پاس سے

گزر گیا۔ بس وہیں ٹپک جاتیں گے۔ ٹپک کا گھوڑا دن آجاتے گا تو نسیم سے اُلجھ چڑیں گے  
وہ تم نے کیوں کہا تھا کہ اس گھوڑے پر نہ لگا تا۔۔۔۔۔ نہیں آئے گا۔“  
ایسی جکی جکی چٹخ ان میں عام سہرتی رہتی ہے۔ جوان کی از معافی زعلی میں رنگ  
بھرتی رہتی ہے۔

نسیم کے دو بچے ہیں جو اکثر تانی کے پاس رہتے ہیں وہ ان کو اسٹوڈیو کی فضا  
سے دلد رکھنا چاہتی ہے اس کو اپنے مرحوم باپ سے بہت پیارا ہے ان کا فوٹو ہر  
دھت اس کے درغیشی جیک میں موجود رہتا ہے۔ مجھے عودتوں کے بلیک جلدی چدی  
دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک روز میں حسبِ عادت نسیم کا بلیک کھول  
کر یہ فوٹو دیکھ رہا تھا کہ وہ آگئی میں نے اس سے کہا: صاف کیجئے گا۔ یہ میری بہت  
بُری عادت ہے۔۔۔۔۔ جانیئے یہ کس کا فوٹو ہے؟

نسیم نے فوٹو اٹھا لیا میں نے کہا اس کو پیسا بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔۔۔۔۔  
”میرے آبا جی کا۔“

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک چہرتی سی پی جی ہے۔ جو مجھ سے یوں کہہ رہی ہے۔  
”میرے آبا جی کا اور کس کا۔“

میں نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟۔۔۔ کیا یہی کافی  
نہ تھا کہ وہ اس کے باپ ہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس کے آبا جی ہیں۔  
ذیل کا یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد میں یہ مسنون ختم کروں گا۔

”بیگم! لیکن کے دوران میں سڑکوں کے ساتھ ایک منظر پر بحث و تمحیص کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی۔ رات کے دو بجے تھے۔ صبح کی پہلی گاڑی سڑے تین بجے ملتی تھی میری بیوی ساتھ تھی۔ جب ہم نے رخصت چاہی تو نسیم نے کہا کہ ”نہیں صغیر یہیں تو جاؤ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا۔“

ہم نے بہت کہا کہ کوئی بات نہیں، موسم اچھا ہے کچھ دیر پلیٹ فارم پر بیٹھیں گے۔ اتنے میں گاڑی آجائے گی۔ مگر نسیم اور اصناف نے بہت اصرار کیا کہ ہم شہر جائیں مگر جی چپے گئے۔ اس لئے کہ ان کے پاس سو فرقی، اور انہیں بہت دودھ نہیں جانا تھا۔ میں باہر باغیچے میں سو گیا، صاف دھوپ میں کمرے میں سوئے پر لیٹ گئے۔ صبح ناشتہ کر کے جب میں اور صغیر گھر چلے تو راستے میں اس نے مجھے یہ بات سنائی جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

جب صغیر اور نسیم سونے کے لئے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں ایک چنگ تھا۔ صغیر نے اصرار دیکھا اور نسیم نے کہا کہ ”آپ سو جائیے۔“

نسیم مسکرائی اور چنگ پر نئی چادر بچھا کر کہنے لگی ”ہاں ہرے تو بدل لیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک نیا سیلنگ سوٹ نکالا، ”یہ تم پہن لو۔۔۔ بالکل نیا ہے۔“ ”بالکل نیا“ یہ زور تھا۔ جن کا مطلب میری بیوی سمجھ گئی اور لباس تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ نسیم نے اطمینان سے آہستہ آہستہ شب خوار کا لباس پہننا چہرے کا میک اپ کیا۔ اپنا ناما۔ تو صغیر نے حیرت زدہ ہو کر کہا، ”ٹائٹ فٹنگی پہلی پر نسیم۔“

نسیم کے چیکے ہر تنوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی : یہ سب ایک ایک کا رستانی ہے :

ایک ایک آپ اٹانے کے بعد اس نے چہرے پر مختلف روغنیات طے اور  
 مانجھ دیکر قرآن اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ میری بیوی بے حد متاثر  
 ہوئی۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا : نسیم... نسیم... تم تو ہم لوگوں سے کہیں  
 اچھی ہو... :

اس احساس سے کہ یہ بات اس نے ڈھنگ سے نہیں کہی مفید ایک  
 دم خاموش ہو گئی۔

قرآن کی تلاوت کرنے کے بعد نسیم سو گئی۔  
 پری چہرہ نسیم..... ہکاؤ کی لود جہاں..... کلاہ سن..... احسان کی کوشن  
 .... پھسیاں کی جتی اور وہ بچوں کی ماں !

## اشوک کمار

محکم الحسن جب دیوکارانی کو لے آئے۔ تو بہن ٹائیز میں افراتفری ہیں نئی فلم کا آغاز  
ہر چا تھا۔ چند مناظر کی شوٹنگ پائیٹھیں کو پہنچ چکی تھی کہ نجم الحسن اپنی ہیروئن کو  
سلو لائینڈ کی دیکھ کر کہنے لگے کہ حقیقت کی دنیا میں لے گیا۔ بیٹے ٹائیز میں سب سے  
زیادہ پریشان اور متشکر شخص ہانسوراٹے تھا۔ دیوکارانی کا شوہر اور بیٹے ٹائیز  
کا "دل و دماغ پس پرودہ"

ایس مگر ہی مشہور جرمی میکر فلم ساز اشوک کمار کے بہنوئی ہان وٹوں سے  
ٹائیز میں مٹر ساوک واپا ساونڈ ایمپریٹ گٹ کے اسٹنٹ تھے صرف بنگال  
ہرنے کی وجہ سے انہیں ہانسوراٹے سے ہمدردی تھی وہ چاہتے تھے کہ کسی دکنی طرح  
دیوکارانی والیں آجائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آقا ہانسوراٹے سے مشورہ کئے بغیر

اپنے طور پر کوشش کی اور اپنی منسوخت حکمت علی سے دیو کارانی کو آمادہ کر لیا کہ وہ نکلے میں اپنے عاشق نجم الحسن کی آغوش چھوڑ کر واپس بجے ٹائیکز کی آغوش میں چلے آئے جس میں اس کے باہر کے پہننے کی زیادہ گنجائش تھی۔

دیو کارانی واپس آگئی، ایس مگر جی نے اپنے جذبات آقا ہانسورائے کو بھی اپنی حکمت علی سے آمادہ کر لیا کہ وہ اسے قبول کر لیں۔ اور بے چارہ نجم الحسن ان عاشقوں کی فہرست میں داخل ہو گیا جن کو سیاسی، مذہبی اور سرمایہ دارانہ حکمت علیوں نے اپنی محبوباؤں سے جدا کر دیا تھا۔

ذیر تنگیں علم سے نجم الحسن کو تین ہی سے کات کر ددی کی ٹوکر میں پسینک تو دیا گیا۔ مگر اب یہ سوال درپیش تھا کہ عشق آشنا دیو کارانی کے لئے سیلوانڈ کا ہیرو کون ہو۔

ہانسورائے اک بے حد محنتی اور دوسروں سے الگ تنگ رہ کر خاموشی سے اپنے کام میں شب و روز منہمک رہنے والے نظم ساز تھے انہوں نے بجے ٹائیکز کی نیوکچہ اس طرح ڈالی تھی کہ وہ ایک باوقار درس گاہ معلوم ہو رہی ہے جس سے کہ انہوں نے بمبئی شہر سے دور مصافحات میں ایک گاؤں کو جس کا نام "ملاو" ہے اپنی نظم کہنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ باہر کا آدمی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ باہر کے آدمیوں کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں تھی، نجم الحسن بھی باہر کا آدمی تھا، یہاں پھر ایس مگر جی نے اپنے جذباتی آتما کی مدد کی۔ ان کا سارا اشوک کمار

بی ایس سی پاس کر کے ایک برس لگتے میں وکالت پڑھنے کے بعد مجھے ٹائیکز کی لیبارٹری میں بغیر تنخواہ کے کام سیکر دیا تھا۔ تاک نقشہ اچھا تھا۔ تھوڑا بہت گواہی بھی لیتا تھا مگر بی نے چنانچہ بیسین تہہ کر کے ہیرہ کے لئے اس کا نام لیا۔ ہانسو رائے کی ساری زندگی تجربوں سے دوچار رہی تھی انہوں نے کہا دیکھ لیتے ہیں جرمین کیو مین در شنگ نے اشوک کا ٹیسٹ لیا۔ ہانسو رائے نے دیکھا اورد پاس کر دیا۔ جرمین فم ڈائریکٹر ڈانڈا دسٹن کی رائے ان کے برعکس تھی۔ مگر بیٹے ٹائیکز میں کس کی مبالغہ کرنا ہانسو رائے کی رائے کے خلاف اظہار خیال کر کے۔ چنانچہ اشوک کمار کا ٹھکانا جہان دونوں بشکل ۲۲ برس کا ہو گا دیوکارانی کا ہیرو منتخب ہو گیا۔

ایک فلم تھی اورد فلم تھی ..... کئی فلم نہیں اورد دیوکارانی اور اشوک کمار کا ذبحا ہونے والا فلمی جوڑا بن گیا ان فلموں میں سے اکثر بہت کامیاب ہوئیں۔ مگر ایسی دیوکارانی اور بڑا ہی بے ضرر اشوک کمار۔ دونوں سلولائیڈ پر شیر و شکر ہر کرتے تو بہت ہی پیارے لگتے۔ مصوم ادائیں۔ اسٹریٹرزے ..... بڑا ہنسائی قسم کا عشق ..... لوگوں کو جو جادو خانہ عشق کرنے اور دیکھنے کے شوقین تھے۔ یہ دم و خانہ نک اور پکلیا عشق بہت پسند آیا۔ خاص طور پر اس نئے فلمی جوڑے کے گردیدہ ہو گئے سکولوں اور کالوں میں طلبات کا (خصوصاً ان دنوں) ایتھریل ہیرو اشوک کمار تھا اور کالج کے لڑکے بس اس کے استیوں والے جگال کرتے ہیں کرتے پھرتے تھے۔

تو بن کی چڑیا۔ میں بن کا پنہیں بن بن بلوں سے



میں نے اشوک کے چند فلم دیکھے۔ دیوکانانی اس کے مقابلے میں جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے میلوں آگے تھے اور ہیرو کے روپ میں اشوک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چوکلیٹ کا بنا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اس نے پُر پُر ڈے کھالے اور بنگال کے آدشی ایسی عشق کی پیشک سے بیدار ہونے لگا۔

اشوک جب ایسا بڑی کی چلیں سے باہر نکل کر تقریباً پورے پرایاتو اس کی تنخواہ پچھتر روپے مقرر ہوئی۔ اشوک بہت خوش تھا۔ ان دنوں اکیل جان کے لئے والد وہ بھی شہر سے دور دراز گاؤں "ملاو" میں اتنے روپے کافی تھے۔ جب اس کی تنخواہ ایک دم دوگنی ہو گئی یعنی ایک سو پچاس روپے ماہوار تو وہ اور بھی زیادہ خوش تھا۔ لیکن جب ڈیرہ کے ڈھائی مقرر ہوئے تو وہ گھبرا گیا اس نے مجھے اس وقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا: "بان گوڈ۔۔۔۔۔۔ میری حالت عجیب و غریب تھی۔ ڈھائی سو روپے۔۔۔۔۔۔ میں نے کیشیر سے نوٹ لئے تو میلر ناتھ کا پیٹھ لگا۔ بکھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے روپے کہاں رکھوں۔۔۔۔۔۔ میز گھر تھا۔۔۔۔۔۔ ایک چھوٹا سا کوارٹر۔ ایک چارپائی تھی۔ دو تین کرسیاں۔ چادروں طرف جھل۔۔۔۔۔۔ رات کو اگر کوئی چور آجائے۔۔۔۔۔۔ یعنی اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں تو کیا ہو؟۔۔۔۔۔۔ میں ایک عجیب بکھر میں پڑ گیا۔ چھری ڈکیتی سے میری جان جاتی ہے۔ گھر آکر بہت سیکیں جاتیں آخر یہ کیا کہ وہ لوٹ چارپائی کے نیچے لیٹی ہوئی درسی میں چھپا دیتے۔۔۔۔۔۔ ساری رات بڑے ڈر ڈرے خواب

آتے رہے..... صبح اٹھ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ نوٹ اٹھا کر ڈاک خانے میں جمع کرا دیے۔

اشوک مجھے یہ بات اپنے مکان پر منار ڈا تھا کہ گتے کا ایک فلم ساز اس سے ملے آیا، کنٹرکٹ ٹیڈ تھا مگر اشوک نے اس پر دستخط نہ کئے۔ وہ اسی ہزار روپے دیتا تھا اور اشوک کا رکارڈ مطالبہ پورے ایک لاکھ کا تھا۔... کہاں ڈو حائی سو روپے اور کہاں ایک لاکھ!

بچے نائیکز میں اشوک کے ساتھ ساتھ اس کے بہنوئی ایس کبھی نے بھی ترقی کی۔ آدمی ذہین تھا۔ گرو ویش جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کا بنظر غائر مطالعہ کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ پروڈیوسر بن گیا..... معمولی پروڈیوسر نہیں بہت بڑا پروڈیوسر جس نے مجھے نائیکز کے جھنڈے تلے کٹی سلور اور گولڈن جوبلی فلمیں بنائیں اور منظر نگاری میں ایک خاص اسکول کی بنیاد ڈالی..... راقم الحروف اس صنف میں اس کو اپنا استاد مانتا ہے۔

اشوک کی ہر عمر سبزی دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ چونکہ وہ باہر بہت ہی کم نکلتا تھا اور الگ تنگ رہتا تھا۔ اس لئے جب لوگ کہیں اس کی جھلک دیکھ پاتے تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ چلتی ٹریک بند ہو جاتی اس کے چاہنے والوں کے ٹھٹھ لگ جاتے اور اکثر اوقات پولیس کے ڈنڈے کے زور سے اسے جوم کی بے پناہ عقیدت سے نہات دلا تا پڑتی۔



اشوک کو اس ایکٹریس کا جسم پسند تھا۔ ہر وقت دھلی دھلی بکھری نکھری ہوتی تھی اس کی یہ چیزیں اشوک کو بہت بھاتی تھیں۔ چنانچہ جب اُس نے تھلا بازی لگا کر اس کو اپنا بھائی بنالیا تو اشوک کو کافی گرفت ہوئی۔

اشوک عشق پیشہ نہیں۔ لیکن ہلک جھانک کا مرض اُس کو عام مردوں کا سا ہے عورتوں کی دعوت طلب چیزوں کو باقاعدہ غور سے دیکھتا ہے اور ان کے شعلوں اپنے دوستوں سے باتیں بھی کرتا ہے۔ کہیں کبھار کسی عورت کی جسمانی قربت کی خواہش بھی غوس کرتا ہے۔ مگر بقول اس کے منثور یاد..... بہت نہیں پڑتی :

ہمت کے معاملے میں وہ واقعی بہت بردا ہے۔ لیکن یہ بھو داپن اس کی ازدواجی زندگی کے لئے بہت ہی مہلک ہے اس کی بیوی شو بھاسے اگر اس کی اس کمزوری کا ذکر کیا جائے تو یقیناً وہ یہ بھی کہے گی : ”خدا کا شکر ہے کہ گانگولی میں ایسی ہمت نہیں اور خدا کرے اُس میں یہ ہمت کہیں پیدا نہ ہو“

مجھے حیرت ہے کہ اُس میں یہ ہمت اور جرأت کیوں پیدا نہ ہوئی جب کہ سینکڑوں لڑکیوں نے جرأت و غرور سے کام لے کر اس کو عشق کی آگ میں کودنے کی ترغیب دی اس کی فانی ڈاک میں بلا مبالغہ ہزاروں عورتوں کے عشق و محبت سے مبریز خطوط آئے ہوں گے۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں۔ خطوط کے اس انبار میں سے اُس نے شاید ایک سو بھی خود نہیں پڑھے..... خطراتے میں اس کا

مرل سیکرٹری ڈی سوفا انہیں مزے لے لے کر چڑھتا ہے اور دون بدن مریں ہوتا جاتا ہے۔

تقسیم سے چند ماہ پہلے اشوک فلم چند شیکم کے سلسلے میں لگتے میں تھا شہید سہروردی اس وقت وزیراعظم بنگلہ کے ہاں سے سولہ علی میر ظلم دیکھنے کے بعد اپنے ذریعے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں دو خوبصورت اینگلو انڈین لڑکیوں نے اس کی موٹر روکی اور لفٹ چاہی۔ اشوک نے چند منٹ کی بھاشی کر لی۔ مگر اُسے اپنے نئے سگریٹ کیس سے ہاتھ دھونے پڑے ایک لڑکی جو شوخ و شنگ تھی۔ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ کیس بھی لے آئی۔ اس واقعے کے بعد اشوک نے کئی بار سوچا کہ ان سے دسی راہ پیدا کی جائے بات معمولی تھی مگر اس کی بہت بڑی۔

کو لھا پور میں گرز، تلوار اور ڈھال قسم کی بھاری بھرکم ہونٹ فلم بن رہی تھی اشوک کا تقویرا سا کام اس میں باقی رہ گیا تھا وہاں سے کئی بلاؤس آئے مگر وہ نہ گیا اس کی طبیعت اس مول سے بہت متنفر تھی۔ جو اُسے ادا کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ مگر کنٹرکٹ تھا۔ آخر ایک روز اُسے جانا ہی پڑا۔ ساتھ مجھے لے گیا۔ اُن دنوں میں قلمستان کے لئے ”آٹھ دن“ نامی فلم لکھ رہا تھا جو نکر یہ فلم اُسے پروڈیوس اور ڈائریکٹ کرنا تھی۔ اس لئے اُس نے کہا: چلو بار..... وہاں آرام سے کام کریں گے۔

مگر آرام کہیں ... لوگوں کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اشوک کار کو لہا پور آیا ہے چنانچہ  
اُس ہوش کے ارد گرد جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ ذاترین جمع ہونے شروع ہو گئے ہوش کا ہلکا  
ہوشیہ تھا کسی نہ کسی جہانے وہ ان لوگوں کو منتشر کر دیتا لیکن پھر بھی بعض جیکوئم  
کے لوگ ہوش کا طواف کرتے رہتے اور اپنے محبوب ایکٹر کی زیارت کر ہی لیتے  
اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ اشوک جیسا کہ میں پہلے سب بچا ہوں۔ بہت ہی اکثر  
قسم کا سلوک کرتا رہا مجھے معلوم نہیں اُن کا رویہ عمل کیا تھا۔ مگر بحیثیت ایک منظر  
کے مجھے سنت گرفت ہوئی تھی۔

ایک شام ہم دونوں سیر کو نکلے۔ اشوک "کیون فلاڈ" کہتے تھا۔ ہاتھوں پر چوڑا  
چمکا۔ گہرے رنگ کا چنرہ ..... ایک ہاتھ میں چنری دوسرے ہاتھ میں میرا  
کندھانا کہ حسب ضرورت مجھے آگے پیچھے کر سکے۔ اسی طرح ایک اسٹوڈ میں بیٹھے  
اشوک کو کو لہا پور کے اسٹوڈیو کے گرد و غبار کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے  
کوئی دھانچہ دیا تھا۔ جب اُس نے اسٹوڈیو سے یہ طلب کی تو اُس نے میری  
"نظر" اپنے گاہک کی طرف دیکھا اور انداز کی طرف جڑا لیکن فوراً ہی ڈی  
لیٹ ایکشن "ببب کی طرح پشٹا اور مڑ کر اشوک سے مخاطب ہوا۔"  
آپ ..... آپ کون ہیں؟

اشوک نے جب دیا۔ میں کون ہوں؟ ..... میں وہی ہوں جو کہ  
میں ہوں؟

استور والے نے غور سے اشوک کے چہرہ اور اسے چہرے کی طرف دیکھا۔ آپ  
اشوک کاہن میں؟

اشوک نے بڑے دل شکن لبے میں کہا: اشوک کا کوئی اور ہو گا۔ چلو نشو۔  
یہ کہہ کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دوا خرید سے بغیری ہم  
دونوں استور سے باہر تھے۔ ہوتل کا موڑ مرنے لگے تو سامنے تین مرستی دیکھیں  
نمودار ہوئیں۔ بہت صاف ستھری، گوری چٹی۔ ماتھوں پر گم گم، بانوں میں  
دینیاں (پھولوں کے گجرے) پیروں میں ہلکے پھلکے چل۔ ان میں سے ایک جس کے  
ہاتھوں میں موسیاں تھیں، اشوک کو دیکھ کر دوسرے کا پنی، بھنی ہوئی آواز میں  
اس نے اپنی سبیلیوں سے کہا: اشوک! اور اس کے ہاتھوں کی ساری موسیاں  
سڑک پر گر پڑیں، اشوک نے میز کندھا چھوڑا اور بھاگ گیا۔

اشوک سے میری پہلی ملاقات فلستان میں ہوئی۔ جب ایس کرجی کی پوسی ٹیم  
نے جے ٹاکنز چھوڑ کر اپنا نیا فلمی ادارہ قائم کر لیا تھا۔ میں تو میں نے کئی بار اس کی  
جھلکیاں دیکھی تھیں مگر اس سے مفصل ملاقات فلستان ہی میں ہوئی۔ جب میں  
وٹاں ملازم ہو گیا۔

فلمی دنیا کی ہر شخصیت پردے پر کچھ اور پردے سے نکل کر کچھ اور ہی ہوتی  
ہے۔ اشوک کو چنانچہ جب میں نے پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا تو پردے کے اشوک  
سے بہت مختلف تھا۔ گہرا سونوار رنگ، موٹے اور کھردرے ہاتھ مضبوط

کسرتی جسم۔ نیم گنوار لب و لبو۔ اکھڑا اکھڑا غیر فطری مختلف۔ تعارف کرایا گیا تو میں نے اس سے کہا: آپ سے مل کر جی مسرت ہوئی ہے۔

اشوک نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ سوتے سوتے الفاظ پر مثل تخیال لگتا تھا۔ جیسے اُس نے یہ لفظ رستے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ گلستان میں ایک صاحب سیر و تفریح کئے آئے۔ آپ نے بڑے پُر تکلف انداز میں اشوک سے کہا: مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خاکسار کو اس سے پہلے ہی جناب سے شرفِ ملاقات حاصل ہو چکا ہے۔

اشوک نے گڈ مڈ ہے میں جواب دیا: جی..... جی مجھے کبھی مقابلہ نہیں ہوا۔ مقابلے کا کاف اُس نے حلق سے نکالا..... لیکن فوراً ہی اس کو احساس ہوا کہ اُس نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے مگر وہ گول کر گیا۔

اشوک کو اردو بہت اچھی لگتی ہے شروع شروع میں اُس نے اُس زبان میں لکھنا پڑھنا شروع کیا مگر قاعدے سے آگے نہ بڑھ سکا پھر بھی اس کو تصویری سی شدہ ہے ایک دو سطر اردو لکھ لیتا ہے تقسیم کے بعد جب میں اُسے چھوڑ کر بجے ٹاکیوز سے چلا آیا تو اُس نے مجھے اردو میں ایک خط لکھا کہ واپس آ جاؤ۔ مگر افسوس ہے کہ میں چند در چند وجہ کے باعث اس کا جواب نہ دے سکا۔

میری بیوی بھی دوسری عہد توں کی طرح اشوک گمار کی بہت مدد تھی۔



ایک دن میں اشوک کو اپنے گھر لے آیا کرے میں داخل ہوتے ہی میں نے  
 زور سے آواز دی: "صفیہ... ..! ڈا اشوک کہا آیا ہے؟"

صفیہ اندر دوٹی پکار ہی تھی۔ جب میں نے پے درپے آوازیں دیں تو  
 وہ باہر نکل۔ میں نے اشوک سے اس کا تعارف کرایا۔ یہ میری بیوی ہے دادا منی  
 .... نا تھ ملاؤ اس سے۔"

صفیہ اور اشوک دونوں جھینپ گئے۔ میں نے اشوک کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 "نا تھ ملاؤ دادا منی .... شرماتے کیا ہو؟"

مجبوراً اُسے نا تھ ملا پڑا۔ اتفاق سے اُس روز قیسے کی روٹیاں تیل کی جا  
 رہی تھیں۔ اشوک کھا کے آیا تھا مگر جب کھانے پر بیٹھا تو تین ہڑپ کر گیا۔  
 یہ عجیب بات ہے کہ بچے میں اس کے بعد جب کبھی جلد سے یہاں قیسے کی  
 روٹیاں تیار ہوتیں۔ اشوک کسی دکنی طرح اُن موجود ہوتا اس کی توجہ میں کر  
 سکتا ہوں نہ اشوک۔ دانے دانے پر مہر والا چچی قیسے معلوم ہوتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی اشوک کو دادا منی کہا ہے۔ بنگلہ میں اس کا مطلب ہے  
 بڑا بھائی .... اشوک سے جب میرے مراسم بڑھ گئے تو اُس نے مجھے مسود  
 کیا کہ میں اُسے دادا منی کہا کروں۔ میں نے اُس سے کہا: "تم بڑے کیسے ہوئے  
 حساب کرو۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔"

حساب کیا گیا تو وہ مجھ سے عمر میں دو ماہ اور کچھ دن بڑا نکلا۔ چنانچہ اشوک

اور سرنگانگولی کے بجائے مجھے دادا منی کہنا پڑا۔ یہ مجھے پسند بھی تھا کیونکہ اس میں  
 بنگالیوں کی محبوب منھائی میں گئے کی شہاس اور گولائی تھی۔ وہ مجھے پیسہ سرسٹو کہتا  
 تھا جب اس سے دادا منی کہنے کا سہارہ ہوتا۔ تو وہ مجھے صرف سٹو کہنے لگا۔ حالانکہ مجھے  
 یہ ناپسند تھا۔

پردے پر وہ مجھے چاکر لیٹ بیرو معلوم ہوتا تھا مگر جب میں نے اس کو  
 سلائیڈ کے غول سے باہر دیکھا تو وہ ایک کسرتی آدمی تھا اس کے کتے میں اتنی قوت  
 تھی کہ دروازے کی کھڑکی میں شگاف پڑ جاتا تھا ہر روز گھر پر بانگ کی  
 مشق کرتا تھا۔ شکار کھینے کا شوقین تھا۔ سخت سے سخت کام کر سکتا تھا انہوں  
 مجھے صرف اس بات کا سہارا اُسے آرائش کا قطعاً ذوق نہیں تھا۔ وہ اگر  
 چاہتا تو اس کا گھر دکھش سے دکھش سا دوسرا من سے آگاہ ہوتا مگر اس طرف  
 وہ کبھی توجہ دیتا ہی نہیں تھا اور اگر دیتا تھا تو اس کے نتائج غیر متا مانہ ہوتے تھے  
 برش اٹھا کر خود ہی سارے فرنیچر پر گہرا نیلا پینٹ تھوپ دیتا یا کس صورتے کی پشت  
 تود کر اسے دیوان کی بھونڈی شکل میں تبدیل کر دیا۔

مکان سمندر کے ایک خینا کدر سے پر ہے۔ نکلن پانی کے چھینے باہر کھڑکیوں کی  
 سلاخوں کو چاٹ رہے ہیں۔ جگہ جگہ روپے کے کام پڑنگ کی پٹریں بھی ہیں ان  
 سے بڑی اور اسی پھیلائے والی برا رہی ہے۔ مگر اشوک اس سے قطعاً غافل  
 ہے۔ ریفریجریٹر باہر کو درمی ڈور میں پڑا جگہ مار رہا ہے اس کے ساتھ لگ

کر اس کا گرانڈیل اسے شین کتا سورا ہے ۔ پاس کرے میں نیچے اوپر صوبہ  
رہے ہیں اور اشوک غسل خانے کے اغد یاٹ پر بیٹھا دیواروں پر حساب  
لگا کر دیکھ رہا ہے کہ ایس میں کون سا گھوڑا دین آئے گا یا مکالوں کا پرچہ ہاتھ  
میں لئے ان کی ادائیگی موش رہا ہے ۔ اشوک کو فرست الیدین پامتری اور  
علم نجوم سے خاص شغف ہے ۔ عونا الذکر علم اس نے اپنے باپ سے سیکھا ہے  
مستند کتابیں بھی پڑھی ہیں فرصت کے اوقات میں وہ شغل کے طور پر اپنے دوستوں  
کی جنم پترتیاں دیکھا کرتا ہے ۔

میرے مستندوں کا مطالعہ کر کے اس نے ایک دن بھر سے سرسری طور پر  
پوچھا : تم شادی شدہ ہو؟

میں نے اس سے کہا : تمہیں معلوم نہیں؟

اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا : جانتا ہوں ..... لیکن دیکھو

منٹو ایک بات بتاؤ ..... نہیں ..... تمہارے تو ابھی اولاد نہیں ہوئی :

میں نے اس سے پوچھا : بات کیا ہے ..... بتاؤ تو نہیں :

اس نے جھپکاتے ہوئے کہا : کچھ نہیں ..... جن لوگوں کے ستاروں کی

پوزیشن ایسی ہوتی ہے ان کی پہلی اولاد لا کا ہوتی ہے ..... مگر وہ زندہ

نہیں رہتا ۔

اشوک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا وہ ایک سال کا بھر کر مر گیا تھا ۔

اشوک نے جے لہد میں بتایا کہ اس کا پہلا بچہ جو کہ لڑکا تھا مردہ پیدا ہوا تھا۔ اس نے مجھے کہا۔ تمہارے اور میرے ستاروں کی پوزیشن قریب قریب ایک جیسی ہے اور کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ جن لوگوں کے ستاروں کی پوزیشن ایسی ہو ان کے ہاں پہلے اولاد لڑکا نہ ہو اور وہ نہ خرسے۔

اشوک کو علم نجوم کی صحت پر پوز پوز یقین ہے بشرطیکہ حساب درست ہو۔ وہ کہا کرتا ہے جس طرح ایک پانی کی کئی بیش حساب میں بہت جڑی گڑ پڑ پیدا کرتی ہے اس طرح ستاروں کے حساب میں معمولی سی غلطی ہیں کہیں کی کہیں لے جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اثنوق کے ساتھ کوئی نتیجہ قائم نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر سکتا ہے ہم سے سہو ہو گیا ہو۔

ریس کے گھوڑوں کے ٹپ حاصل کرنے میں بھی عام طور پر اشوک اسی علم سے مدد لیتا ہے۔ گھنٹوں بات و دوں میں بیٹھا حساب لگاتا رہتا ہے۔ مگر پوری ریس میں سو روپے سے زیادہ اس نے کبھی نہیں کھیلا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ ہمیشہ جیتتا ہے۔ سو کے ایک سو دس ہو گئے سو کے سو ہی رہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کہ اس کے سو میں سے ایک پانی گم ہوئی ہو..... وہ ریس جتنے کے لئے نہیں مضمّن تفریح کے لئے کھیلتا ہے اس کی حسین و جمیل سیوی شو بھاتیں بچوں کی ماں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ ممبرز انکلوڈر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کونے میں الگ تنگ بیٹھ جاتا ہے۔ ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اپنی

بیوی کو روپے دیتے ہے کرنٹوں نلایں نمبر کے ٹکٹ لے آؤ۔ جب ویس رقم ہوتی ہے تو اُس کی بیوی ہی کٹر کی پر جا کر جیتنے والے ٹکٹوں کے روپے وصول کرتی ہے۔

شوہر بھانڈو عورت ہے۔ تبیلیم راجی ہے۔ اشوک کیا کرتا ہے۔ کان پڑا ہے۔ مگر صرف اڑاوا خاق۔ اس کی اڑاوا ہی زندگی بہت کامیاب ہے۔ شوہر بھانڈو اتنی دولت ہوئے کے باوجود گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی ہے۔ ٹیٹ بچا لیس کی طرح سوتی۔ صحتی پہنے اڑاوا کے پتھر کے ایک کونے میں چامیوں کا پڑا گھپٹا اڑاوا ہے۔ وہ بچے ہمیشہ اپنے گھر میں مصروف کار تفراتی۔ شام کو جب کبھی دسکی کا ایک دور چلتا تو لوگ کی چیزیں شوہر بھانڈو اپنے ہاتھ سے تیار کرتی تھی۔ کبھی ٹیکس پارے کبھی گھنٹی ہونٹ دال۔ کبھی آلوؤں کے تھلے۔

میں قمار زیادہ چینے کا عادی تھا۔ اس نے شوہر بھانڈو سے کہتی تھی: دیکھو گا گولی بمٹر منٹو کو زیادتی مت دینا۔ منٹو منٹو ہم کو بولیں گی:

منٹو منٹو اور منٹو گا گولی دونوں سیلیاں نہیں ان سے ہم دونوں بہت کام نکالنے تھے۔ جنگ کے باعث بڑے اچھے سگڑ تیرب تیرب پائی تھے۔ جتنے ہیں باہر سے آتے تھے سب کے سب بیک داکٹ میں چنے جاتے تھے۔ یوں تو ہم عام طور پر اس بیک داکٹ ہی سے اپنے لیے سگڑ حاصل کرتے تھے۔ مگر جب کسی دینے سے صحیح قیمت پر کوئی چیز مل جاتی۔ تو ہم عجیب و غریب مسرت محسوس کرتے۔

## اشوک کد

مسرگ گول جب شوٹنگ کرنے تلخ تو میری بیوی صید کر کھیں کھیں اپنے ساتھ لے جاتی۔ قریب قریب ہر بڑے وکازدار کو معلوم تھا کہ مسرگ گول مشہور وکیل اشوک کد کی بیوی ہے۔ چنانچہ اس کے طلب کرنے پر بلک مارکیٹ کی تارک ایک تہوں میں چھپائی ہوئی چیزیں باہر نکل آتی تھیں یوں بھی بٹے کے مرد عورتوں کے ہاٹ میں کافی رقم مل واقع ہوتے ہیں۔

بنک سے روپیہ نکلاتا ہو۔ کوئی رجسٹری کراتا ہے۔ سینا یا دیں گا ڈی کے ٹکٹ لینا ہوں۔ مرد پڑاؤ پر گھنٹہ سوکتا رہے گا لیکن اس کے مقابلے میں عورت کو ایک منٹ میں انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔

اشوک نے اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی سے شاید ہی ٹانڈہ اٹھایا مگر دوسرے بعض اوقات اس کے علم کے بغیر اس کے ذریعے سے اپنا اتو سیدھا کر لیتے تھے راجہ مہدی علی خاں نے ایک دفعہ بڑے ہی دلچسپ طریقے سے اپنا اتو سیدھا کیا۔

راجہ گلستان میں ملازم تھا میں گلستان چھوڑ کر ولی صاحب کے لئے ایک کہانی لکھ رہا تھا ایک روز جے ٹیلیفون پر اشوک کے سیکرٹری نے بتایا کہ راجہ مہدی علی خاں بیمار ہیں۔ میں واماں پہنچا تو دیکھا کہ جناب کی بہت بُری حالت ہے لگتا ہے کہ غلاب ہے کہ اکاڑا ہی نہیں تلخ۔ نقابست کا یہ عالم ہے کہ سہارا لے کر بھی اٹھ نہیں جاتا۔ اور آپ ٹیکن پانی کے غلاموں اور غیش بام کی حالت سے اپنا مرض دور کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

مجھے شبہ سا ہوا۔ کہیں ڈپٹیٹر یا نہ ہو۔ چنانچہ میں نے انہیں فوراً موٹر پر لادوا اور اشوک کو ٹیلیفون کیا۔ اُس نے مجھے اپنے ایک واقف ڈاکٹر کا نام بتایا کہ وہاں لے جاؤ۔ میں راجہ صاحب کو وہاں لے گیا۔ تشنیںص کے بعد معلوم ہوا کہ واقعی وہی ممڈی مرض ہے ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق میں نے فوراً ہی متعدد امراض کے ہسپتال میں اُن کو داخل کرا دیا۔ ٹیکے وغیرہ دیے گئے دوسرے روز صبح میں لے اشوک کو ٹیل فون پر راجہ کے مرض کی نوعیت بتائی۔ سبب اُس نے کوئی تشویش ظاہر نہ کی۔ تو مجھے غصہ آ گیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ ایک آدمی ایسے خوفناک مرض میں مبتلا ہے یہاں سے کایہاں کوئی پرسان حال ہی نہیں اور تم کوئی دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔

اشوک نے جواباً صرف اس قدر کہا: آج شام کو چلیں گے اُس کے پاس۔ ٹیلیفون بند کر کے میں ہسپتال میں پہنچا اور دیکھا کہ راجہ کی حالت پہلے کی نسبت کسی قدر بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے جو ٹیکے کہے تھے وہ میں لے آیا تھا۔ یہ اس کے حوالے کر کے اور دم دلا سادے گرمی اپنے کام پر چلا گیا۔

شام کو اشوک نے مجھے وِل کے دفتر میں پکڑ لیا میں نادان تھا مگر اُس نے مجھے بتایا کہ موٹر میں ہسپتال پہنچے۔ اشوک نے راجہ سے معذرت طلب کی کہ وہ بے حد مصروف تھا۔ اور صراحت کر کے باتیں میری اُس کے بعد اشوک مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسرے روز ہسپتال پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں۔ راجا بڑا بیمار بنا بیٹھا ہے۔ بستر کی چادر اچلی، تنگیے کا غلاف اجلا۔ سگریٹ کی ڈبیا، پانی، سر کرنے کی دندوسل پر چھوٹا لٹکا ہوا ہنگ پر تانگ رکھے۔ ہسپتال کا صاف ستھرا جوڑا پہنے بڑے عیاشانہ طرز پر اقبہ کا مٹا لٹکا رہا تھا۔ میں نے حیرت برے بہو میں اس سے پوچھا۔ کیوں راجا؟ یہ سب کیا؟

راجا مسکرایا۔ اس کی یہ بڑی بڑی مونچھیں تھرائیں: یہ تو کچھ بھی نہیں... ابھی اور دیکھنا؟

میں نے پوچھا۔ کیا؟

”عیاشی کے سامان... کچھ روز اور میں یہاں رہا تو تم دیکھو گے کہ پاس والے کمرہ میں میری حرم ملے ہوگی۔ خدا جیتا رکھے میرے اشوک کا کو... بتاؤ وہ کیوں نہیں آیا؟“

تھوڑی دیر کے بعد راجا نے بتایا کہ وہ سب کچھ اشوک کا نور نظہور ہے۔ ہسپتال والوں کو پتہ چل گیا کہ اشوک اس کی بیاد پرسی کے لئے آیا تھا۔ چنانچہ ہر چھوٹا بڑا راجا کے پاس آیا ہر ایک نے اس سے ایک ہی قسم کے متعدد سوال کئے۔

”کیا اشوک واقعی اس کی بیاد پرسی کے لئے آیا تھا؟“

”اشوک سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟“





کی رائے لیتا ہے۔ اس نضائے اگر کوئی اسے باہر لے جاتا ہے تو وہ بہت الجھن محسوس کرتا ہے۔

تعلیم یافتہ ہونے اور بیٹی ٹائیکز جیسے باذوق فلمی ادارے کے ساتھ کئی برسوں تک منسلک رہنے کی وجہ سے اشوک کو فلمی صنعت کے قریب قریب ہر شعبے سے واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ کمرے کی باریکیاں جانتا ہے لیباٹری کے تمام پیچیدہ مسائل سمجھتا ہے۔ اینڈ ٹائنگ کا عملی تجربہ رکھتا ہے اور ڈائریکشن کی گہرائیوں کا بھی مطالعہ کر چکا تھا۔ چنانچہ فلمستان میں جب اُس سے رائے بہادر چترپال ملے تو ایک فلم پر وڈیوس کرنے کے لئے کہا تو وہ فریاد تیار ہو گیا۔

ان دنوں فلمستان کا چروہ گینگنڈا فلم "شکار سی" مکمل ہو چکا تھا اس سٹیج میں کئی ہفتیوں کی لگا تار محنت کے بعد گھر میں بھٹیوں کے مزے اڑا رہا تھا۔ ایک دن سلاوک دھانچا آئے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگے، سلاوک.....  
..... ایک کہانی لکھ دو گنگولی کے لئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ سلاوک کا کیا مطلب ہے میں فلمستان کا ملازم تھا اور میرا کام ہی کہانیاں لکھنا تھا۔ گنگولی کے لئے کہانی لکھوانے کے لئے سلاوک کی سفارش کی کیا ضرورت تھی مجھ سے وہاں فلمستان کا کوئی ذمہ دار مکن بھی کہتا، میں کہانی لکھنا شروع کر دیتا۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اشوک چونکہ فلم خود پر وڈیوس کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کی خواہش ہے کہ میں اُس کی خواہش کے مطابق کوئی شہایت ہی اچھوتی کہانی

لکھوں۔ وہ خود میرے پاس اس لئے آیا کہ وہ دوسروں سے کئی کہانیاں سُن چکا تھا۔  
 بہر حال ساوک کے ساتھ وقت مقبوض ہوا اور ہم سب ساوک ہی کے صاف  
 سترے فلیٹ میں جمع ہوئے۔ اشوک کو کیسی کہانی چاہیے تھی یہ خود اس کو  
 معلوم نہیں تھا۔ پس منٹوالیسی کہانی ہو کر مڑا آجائے..... اتنا خیال رکھو کہ یہ  
 میرا پہلا نظم ہو گا:

ہم سب نے مل کر گھنٹوں منظر باضی کی، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا اُن دنوں آغا  
 خاں کی ڈائمنڈ جوبلی سونے والی تھی جس کے لئے ساوک کے فلیٹ کی پُری طرف  
 برسے برون اسٹیلیم میں ایک بہت بڑا پنڈال تعمیر کیا جا رہا ہے۔ میں نے  
 اس سے انہی دلچسپ حاصل کرنے کی کوشش کی..... ساوک کے سنگ دم  
 میں صنم تراشی کا ایک نہایت ہی عمدہ نمونہ تھا اس کو بھی دماغ میں گمایا پھرایا  
 اپنے پائے کارناموں پر نظر ڈالی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

دن بھر کی سٹی ناکام کی کوفت دور کرنے کے لئے شام کو باہر تیرس پر  
 براہِ تہی کا دور شروع ہوا۔ شراب کے انتخاب میں ساوک کا چاہت ہی عمدہ  
 ذوق کا مالک ہے۔ براہِ تہی چنانچہ فائٹڈ ادا تو رام کی بہت ہی اچھی تھی۔ حلق  
 سے اترتے ہی طبع آگیا۔ سامنے چپ گلیٹ، اسٹیشن تھا۔ میچے بازو میں خوب  
 چہل پہل تھا۔ ادھر بازار کے اقتسام پر مسندِ دندھے منڈیشہ ستار کا خانہ بڑی  
 جڑی قیمتی کادیں سڑک کی چمکیلی سطح پر تیر رہی تھی..... تھوڑی دیر کے بعد

بعد ایک ناچتا ہوا سڑکیں کستنے والا انہن نمودار ہوا..... میں نے ایسے ہی سوچا..... خدا معلوم کہاں سے یہ خیال میرے دماغ میں آن چکا کہ اگر اس طرح سے کوئی خوب صورت لڑکی ایک رختہ گرائے اس نیت سے کہ وہ جس کے ہاتھ لگے گا وہ اس سے شادی کرے گی تو کیا ہو جائے گا..... ہو سکتا ہے کہ رختہ کسی پکڑوٹ موٹر میں جا گرے..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑکا ٹام ڈٹا سڑکیں کوٹنے والے انہن کے ڈرائیور کے پاس جا پہنچے..... ہر کچھ کا یہ سلسلہ کتنا دھڑکتا اور کتنا دلچسپ!

میں نے اس کا ذکر اشوک اور ساوک سے کیا ان کو مزہ آ گیا اور مزہ لینے کی خاطر ہم نے برانڈی کا ایک اور دور چلایا اور بے لگام خیال آرائیں شروع کر دیں۔ جب محض درخواست ہوئی تو طے پایا کہ کہانی کی بنیادیں اس خیال پر مستند کی جائیں۔

کہانی تیار ہو گئی مگر اس کی شکل پورا نہ ہو تھی۔ جیسے کاکھیا ہوا رختہ رنڈا سڑکیں کوٹنے والا انہن۔ پہلے پہلے خیال تھا کہ ٹریسڈی مہرنی چائیے مگر اشوک چاہتا تھا کہ کو میسڈی ہو اور وہ بھی بہت ہی تیز رفتار، چنانچہ دماغ کی سادی قویق اسی حرف صرف ہونے لگیں۔ کہانی مکمل ہو گئی۔ قرا اشوک کو پسند آئی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اب نغمہ کا ایک ایک فریم اشوک کی ہدایات کے ماتحت تیار ہونے لگا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ”آٹھ دن“ نام وہ کمال

اشوک کی ڈاکٹریشن کا نتیجہ تھی کہ پردے پر ڈاکٹر کٹر کا نام ڈی۔ ایس۔ پائی تھا جس نے اس فلم کا ایک بڑا حصہ ڈاکٹر کٹر نہیں کیا تھا۔ بیٹھی ٹائیز میں فلم ڈاکٹر کٹر کو بہت کم اہمیت دی جاتی تھی۔ سب مل کر کام کرتے تھے۔ جب فلم ٹائٹل کے لئے پیش ہوتا تھا تو ایک کارکن کا نام بطور ڈاکٹر کٹر کے پیش کر دیا جاتا تھا یہ طریقہ کار فلستان میں بھی رائج تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پائی فلم ایڈیٹر تھا اور اپنے کام میں بہت ہوشیار چنانچہ متفقہ طور پر یہی فیصلہ ہوا تھا کہ بحیثیت ڈاکٹر کٹر کے اس کا نام فلم کے کریڈٹس میں شامل نہیں پیش کیا جائے۔

اشوک جتنا اچھا کردار کار ہے اتنا ہی اچھا ہدایت کار بھی ہے اس کا علم مجھے "آٹھ دن کی شوٹنگ کے دوران میں پڑا۔ معمول سے معمولی منظر پر بھی وہ بہت محنت کرتا تھا۔ شوٹنگ سے ایک روز پہلے وہ مجھے سے نظر ثانی کیا ہوا سینہ لیتا اور غصہ مانے میں بیٹھ کر گفتگوں اس کی نوک چپک پر غصہ کرتا رہتا ..... یہ عجیب بات ہے کہ ہاتھ و دم کے علاوہ اور کسی جگہ وہ پوری توجہ سے منکر طلب امور پر غور نہیں کر سکتا۔

اس فلم میں چار نئے آدمی بطور ایکٹر پیش ہوئے۔ واجد مہدی علی خان اور چند تاقہ اشک، محسن عبداللہ درچہا سرارینا کے سابق شوہر اور رقم الحروف ..... سب یہ ہوا کہ ایس کمرہ کی کو ایک رول دیا جائے گا۔ مگر وقت آنے پر وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ اس لئے کمان کے قلم "جل جل رہے نوجوان" میں

کیمرے کی دہشت کے باعث میں نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر جی کو بہانہ بنا تھا آیا۔ اصل میں وہ خود کیمرے سے خوفزدہ تھے۔

ان کا رول ایک "نسل شوکنگ" فوجی کا تھا اس لئے لباس وغیرہ صاب تیار تھے۔ جب مگر جی نے انکار کیا تو اشوک بہت سٹشیا کر ان کی جگہ اور کسے منتخب کرے۔ کئی دن شوٹنگ بند رہی۔ راتے بہادر چرنی ڈال جب قل پیسے ہونے لگے تو اشوک میرے پاس آیا۔ میں چند مناظر کو دوبارہ لکھ رہا تھا اس نے میز پر سے میرے کاغذ اٹھا کر ایک طرف رکھے اور کہا "پلو منٹو"

میں اس کے ساتھ چل پر ۱۲۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے نئے گیٹ کی ڈمن منوانے لے جا رہا ہے مگر وہ مجھے سیٹ پر لے گیا اور کہنے لگا: "پاگل کا پارٹ نم کر دو گے"

مجھے معلوم تھا کہ مگر جی انکار کر چکا ہے اور اشوک کو اس خاص رول کے لئے کوئی آدمی نہیں مل رہا۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کبے گا کہ میں یہ رول ادا کروں، چنانچہ میں نے اُس سے کہا: "پاگل ہوئے ہو"۔ اشوک سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ نہیں منٹو تمہیں یہ رول لینا ہی پڑے گا۔ راجہ سہدی علی خاں امداد چندر ناتھ اشوک نے بھی اصرار کیا۔ راجہ نے کہا: "تم نے مجھ کو اشوک کا بہنوئی بنا دیا حالانکہ میں شریف آدمی ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ میں اشوک کی عزت کو ہوں تم پاگل بن جاؤ گے تو کون سی آفت آجائے گی"

اس پر مذاق شروع ہو گیا اور مذاق مذاق میں سعادت حسن منٹو، ہاگل ٹلائٹ لغٹ کر پارام بن گیا۔ .... یکسرے کے سامنے میری جو حالت ہوئی اس کو انڈہ بہتر جانتا ہے۔

غلم تیار ہو کر ٹائٹس کے لئے پیش ہوئی تو کامیاب ثابت ہوئی۔ ناقدین نے اسے بہترین کامیڈین قرار دیا۔ میں اور اشوک خاص طور پر مہبت ہی مسرور تھے۔ اور ہلدا دادہ تھا کہ اب کی کوئی بالکل نئے ٹائپ کی غلم بنائیں گے مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔

ساوک و اچا۔ آٹھ دن کی شوٹنگ کے آغاز ہی میں اپنی والدہ کے علاج کے سلسلے میں لندن چلا گیا تھا وہ جب واپس آیا تو غمی صحت میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ کئی اداروں کے دیوالے پتے گئے تھے بمبئی ٹائیز کی نہایت اہم حالت تھی۔ مہاسروائے آنہمہانی کے بعد دیوکارانی چند برسوں کی عدت کے بعد روس کے ایک جلاوطن نواب کے آرٹسٹ رو کے دور کے سے رشتہ ازدواج قائم کر کے غمی دنیا تیاگ چکی تھی۔ دیوکارانی کے بعد بمبئی ٹائیز پر کئی بیرونی حملوں نے قبضہ کیا مگر اس کی حالت نہ سیدھا رکھے۔ آخر ساوک و اچا لندن سے واپس آئے اور جرأت رندانہ سے کام لے کر بمبئی ٹائیز کی عنان حکومت اشوک کی مدد سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اشوک کو گلستان چھوڑنا پڑا۔ اس دوران میں لاہور سے شرموئی بی گڑھانی

نے تار کے ذریعے سے ایک ہزار روپیہ مہاراجا اور فرسے میں چلا گیا ہوتا تھا۔  
 مجھے ساوک کا انتظار تھا جب اشوک اور وہ دونوں بمبئی ٹائیکرز میں اکٹھے ہوئے تو  
 میں ان کے ساتھ تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے لئے انگریزوں  
 کا یہاں پر نقشہ بنا رہا تھا۔ جس میں چنگی ڈال یہ بی جا لو الگ کٹری ہو کر تماش  
 دیکھنے کے لئے جگہ بنا رہی تھی۔

میں نے جب بمبئی ٹائیکرز میں قدم رکھا تو ہندو مسلم منادات شروع تھے جس  
 طرح کرکٹ کے میچوں میں وکٹیں اڑتی ہیں باؤنڈریاں لگتی ہیں اس طرح ان فسادوں  
 میں لوگوں کے سر اڑتے تھے اور بری بری آگیں لگتی تھیں۔

ساوک واپس آنے بمبئی ٹائیکرز کی ابتر حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد  
 جب انتظام سنبھالا تو اسے بہت سی شکلیں پیش آئیں۔ غیر ضروری عنصر کو خیر باد  
 کے لئے اسے ہندو تھا، جلال باہر کیا۔ تو کافی گلاب چھوٹی مگر جب اس کی جگہ پر لگتی تو  
 مجھے محسوس ہوا کہ کلیسیا آسامیاں سب مسلمانوں کے پاس ہیں۔ میں تھا۔ شایہ  
 تھا، عصمت چشتی تھی، کمال امروہی تھا، حسرت مکھنوی تھا، نذیر احمدی  
 نامہ پانی پتی اور میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر تھا یہ سب جمع ہوئے تو ہندو کا کہہ  
 میں ساوک واپس اور اشوک کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے میں نے  
 اشوک سے اس کا ذکر کیا تو ہنسنے لگا۔ میں واپس سے کہہ دوں گا کہ وہ ایک فائنٹ  
 پلاوے۔



ڈانٹ بتائی گئی تو اس کا اثر اٹا ہوا۔ واپس آکر گنم خط موصول ہونے لگے کہ اگر اس نے اپنے استوثریو سے مسلمانوں کو باہر نہ نکالا تو اس کو آگ لگا دی جائے گی۔ یہ خط واپس چلا گیا تو آگ بجھلا ہو جاتا۔ سارے مجھ سے کہتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں۔ میں غلطی پر ہوں..... میں غلطی پر ہوں تو ان کے باوا کا کیا جانتا ہے..... آگ لگائی تو میں ان سب کو اس پر جھونک دوں گا۔

اشوک کا دل و دماغ فرقہ وارانہ تعصب سے بالکل پاک ہے وہ کہیں ان خطوط پر سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ جن پر آگ لگائے کی دھمکیاں دینے والے سوچتے تھے وہ مجھ سے ہمیشہ کہتا "استوثریو سب دیوانگی ہے..... اہستہ اہستہ دودھ ہو جائے گی۔"

مگر اہستہ اہستہ دودھ ہونے کے بجائے یہ دیوانگی جڑتی ہی چلی جا رہی تھی....  
... اور میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا اس لئے کہ اشوک اور واپس میرے دوست تھے۔ وہ مجھ سے شور سے لیتے تھے اس لئے کہ ان کو میرے خلوص پر بھروسہ تھا۔ لیکن میرا یہ خلوص میرے اندر سکڑ رہا تھا.... میں مر رہا تھا اگر بجٹے چائیز کو کچھ ہو گیا تو میں اشوک اور واپس کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

منا وادست زردوں پر تھے ایک دن میں اور اشوک بھی ٹائیکز سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اس کے گھر دیکھ بیٹھے رہے۔ شام کو اس نے کہا۔ چلو میں تمہیں چھوڑاؤں.... شہادت کش کی خاطر وہ سڑ کو ایک خالص اسلامی محلے میں

لے گیا..... سامنے سے ایک برأت آ رہی تھی جب میں نے جینڈی کی آواز سنی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم اشوک کا ہاتھ پکڑ کر میں چلا آیا۔ وا دامنی۔ یہ تم کو حراٹھے؟

اشوک میرا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر اس نے کہا: کوئی ٹکڑہ کرو؟ میں کیونکر ٹکڑہ کرتا۔ موٹر ایسے اسلامی محلے میں تھی۔ جہاں کسی ہندو کا گزر ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اشوک کو کون نہیں پہچانتا تھا کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو ہے..... ایک بہت بڑا ہندو جس کا قتل سرکر خیز ہو جاتا..... مجھے عربی زبان میں کوئی دیا یا نہیں تھی۔ قرآن کی کوئی موزوں و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی۔ دل ہی میں میں اپنے اور پرستیت بیچ رہا تھا اور دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی زبان میں بے جوڑی دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا مجھے سرخرو کر کیو..... ایسا نہ ہو کوئی مسلمان اشوک کو مار دے۔ اور میں ساری عمر اس کا غلن اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں میری اپنی گردن تھی مگر یہ ایسی فلیس حرکت کے لئے دوسری قوم کے سامنے خدا مت کی وجہ سے جھکنا نہیں چاہتی۔

جب موٹر بات کے جلوس کے پاس پہنچی تو لوگوں نے چلنا شروع کر دیا "اشوک کمار..... اشوک کمار" میں بالکل سچ ہو گیا۔ اشوک اشیرنگ پر ناچہ رکے غاموش تھا میں خوف ہراس کی سچ بستی کے نکل کر ہجوم سے یہ کہنے والا تھا کہ

## گھنے فرشتے

دیکھو ہوش کرو۔ میں مسلمان ہوں۔ یہ مجھے میرے مگر چہرے نے جلد دیا ہے۔ لیکو دفن تو جوانوں نے آگے بڑھ کر بٹے آرام سے کہا: اشوک جاؤ آگے راستہ نہیں ملے گا ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ:

اشوک پچائی؟ اشوک ان کا بھائی تھا۔ اور میں کون تھا؟..... میں نے دفعہ اپنے لباس کی طرف دیکھا جو کھادی کا تھا..... معلوم نہیں انہوں نے مجھے کیا سمجھا ہوگا مگر ہر سکتا ہے کہ انہیں نے اشوک کی مروجہ گی میں بے دیکھا ہی نہ ہو۔

موٹر میں اس اسلامی محفل سے نکل تو میری جان میں جان آئی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تو اشوک ہنسنا تم خواہ خواہ گھبل گئے..... کوسٹوں کو یہ لوگ کچھ نہیں کہا کرتے:

چند روز بعد بیٹے ٹائیز میں نذیرا جمیری کی کہانی راجہ محبوب کے نام سے فلم بند ہوئی آپر میں نے جب کڑی ٹکسٹ پیرینی کی اور اس میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں، تو نذیرا جمیری نے اشوک اور واپس سے کہا: "نفس کو آپ ایسے مباحثوں کے دوران میں نہ جھٹایا کریں وہ چونکہ خود افسانہ نویس ہیں اس لئے متعصب ہے۔"

میں نے بہت غور کیا۔ کچھ کچھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا عشق بھائی..... اگلے راستہ نہیں ملے گا..... موٹر روک لو..... ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ:

اور میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا جہاں میرے افسانے نے ٹھنڈا اگرشت پر مقدمہ چلایا گیا۔

# زگرس

عرصہ ہوا۔ لو اب پختہ دہی کی صاحب زادی تسنیم (منتر تسنیم سلیم) نے  
مجھے ایک خط لکھا تھا:-

• تو کیا خیال ہے آپ کا اپنے بہنوئی کے متعلق ہو وہ جوان خاوند  
آپ کی طرف سے لگا کر لڑتے ہیں تو مجھے اپنے لئے شادی مرگ  
کا اندیشہ ہوا جاتا ہے۔ اب میں آپ کو تفصیل سے بتا دوں گا کہ  
یہ حضرت مجھے آپ کے نام سے چھیڑا کرتے تھے اور ان کا  
خیال تھا کہ جب وہ میرے نادیدہ بھائی سے ملیں گے، تو  
نہ جانیں کیا کیا حماقتیں سرزد ہوں گی...! اور مجھے شرمندگی  
ہرگز۔ اور اب پرسوں سے مسرور ہیں کہ بیٹی چن کر منٹوسے ملو۔

بہت ہی دلچسپ آدمی ہیں۔ اور اس طرح کہتے ہیں۔ گویا  
منٹو میرے سہائے ان کا بھائی ہے۔ اور میں ہمیشہ سے  
بہت قریبی دوستوں کی طرح ہوں۔ .... ذرا دیر  
تو ملاحظہ کیجئے۔ .... بہر حال بہت خوش ہیں کہ میرا انتخاب  
بہت خوب رہا۔ .... ہمارے برادر محترم یعنی ابن بھائی  
سلیم سے قبل ہی پہنچ گئے تھے۔ اور انہوں نے سب سے  
قبل یہی بات بتائی کہ وہ آپ سے نیاز حاصل کر کے آئے  
ہیں۔ دُکس کا ذکر عدا گول کر کے باقی سب تفصیل سے بتا دیا۔  
پھر جب سلیم آئے تو انہوں نے نہ صرف داستانِ حبیبہ سنا  
بتائی بلکہ آپ کی اور منتخب کی جگہ کا واقعہ بھی دلچسپی سے  
بیان کیا۔ اس سلسلے میں سلیم سفاقی خواہ ہیں دوبارہ  
جدن بائی کے یہاں جانے کے مرکز شمشاد بھائی (جو آپ  
سے مل چکے ہیں) وغیرہ تھے۔ اور ان سے ممکن ہوتا تو آپ  
سے علاوہ نہ جانے اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ سلیم  
کو اگر عشق ہوا ہے تو لڑا چٹنس سے وہ نہ ایسے بد نظر  
بھی نہیں۔

میں بہت معروف صاحبِ سلیم میرے یہاں آئے ان سے میری پہلی

ملاقات تھی۔ ادا بقول نسیم کے وہ میرے بہنوئی تھے اس لئے ان کی خاطر داری کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ گھر میں جو حاضر تھا ان کو ادا مان کے معاصیوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ فلم سے متعلق لوگوں کے پاس ایک ٹھننے کی چیز ضرورتاً ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی ان کو شہری ساؤنڈ اسٹوڈیو میں دکھا دی گئی۔ خالہ ”پھول“ تھی جسے ڈائریکٹر دھانسیو نے آصف بنا دیا تھا۔

سلیم اداؤں کے ساتھیوں کو بظاہر مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا پروگرام بنا کر بیٹے پہنچے تھے۔ سلیم نے برصغیر تذکرہ مجھے پوچھا: کیا صاحب زنگی کہیں ہوتی ہے۔ آج کل؟

میں نے اذراہ مذاق کہا: اپنی ماں کے پاس۔

میرا مذاق غیر طبعی ہوسٹ کی گود میں چلا گیا۔ جب میرے مہمانوں میں سے ایک نے بڑی خواہانہ سلوہ لوسی سے کہا: ”جتن بائی کے پاس؟“

”جی ہاں“

سلیم نے پوچھا: کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ میرا یہ مطلب ہے کہ میرے یہ دوست اس کو دیکھنے کے بہت شائق ہیں۔۔۔۔۔ کیا آپ اس کو جانتے ہیں؟

میں نے جواب دیا: ”جانتا ہوں۔۔۔۔۔ مگر معمولی سا۔“

ایک صاحب نے مجھے ڈھب انداز میں سوال کیا: کیوں؟

”اس سے کتنا ہے اور مجھے ابھی تک کسی فلم میں اکتھے کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔“  
 سلیم نے یہ سن کر کہا: ”تو جھوٹے..... ہم آپ کو خواہ مخواہ تکلیف  
 دینا نہیں چاہتے۔“

لیکن میں خود زنگس کے پاس جانا چاہتا تھا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا مگر اکیلا جانا مجھے پسند  
 نہیں تھا۔ ساتھ ملتا تو تھا مگر نہایت ہی بے ہودہ۔ یعنی دید سے بھاڑ بھاڑ کر گزرنے  
 والا۔ اب موقع تھا آدمی سادہ لوں تھے۔ محض عیاشی کے طوع پر زنگس کو  
 ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ واپس اپنی جاگیروں اور ریاستوں میں جا کر  
 اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو شہود فلم اسٹارڈ زنگس کے چشم دید حالات  
 سنائیں۔ چنانچہ میں نے سلیم سے کہا: ”تھکیف کی کوئی بات نہیں۔ چلتے ہیں۔ لیکن  
 بے علاقہات ہر جائے۔“

میں زنگس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ بجے میں اتنی ایکڑ میں تھیں جن کے پاس  
 میں جب چاہتا تھا سکتا تھا۔ مگر خاص طوع پر زنگس سے ملنے کا کیا مطلب تھا؟  
 میرا خیال ہے اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ کو ایک دلچسپ  
 واقعہ سنادوں۔

میں فلستان میں ملازم تھا۔ صبح جاتا تو شام کو آٹھ کے قریب ٹوٹا ایک ہند  
 اتفاق سے واپس جلدی ہوئی۔ یعنی میں دوپہر ہی کے قریب گھسٹو بیچ گیا ہندو مال  
 سہارا تو ساری فضا مرعش نظر آئی۔ جیسے کوئی ساز کے تار کو چیر کر خود چھپ گیا ہے

ڈورنگ ٹینس کے پاس میری دو سائیاں کھڑی بٹھا ہوا اپنے بال گوندھ رہی تھیں۔ مگر ان کی انگلیاں ہوا میں چل رہی تھیں۔ ہونٹ دونوں کے پھر پھر ہمارے ہاتھ لگا کر اتر جہیں تختی تختی دونوں میں مل کر گھیرا ہوا تھا، ایسی تصویر پیش کر رہی تھیں جو اپنی گھبراہٹ پر بھانے کی خاطر بے مطلب دوپٹے اوڑھنے کی کوشش کر رہی ہو ٹھنڈ کرے کے دروازے کا پردہ اندر کی طرف دبا ہوا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف تصویر نگاہوں کی طرف دیکھا۔ ہولے ہولے کھسکھس کر کی۔ پھر دونوں نے ایک نشست کہا: "سبحا جی سلام!"

"وعلیکم السلام" میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا کیا بات ہے؟ میں نے سوچا کہ سب میں کرینما جا رہی ہیں۔ دونوں نے میرا سوال سن کر پھر کھسکھس کر پھر ایک دم کھلکھلا کر نہیں اور دوسرے کمرے میں جاگ گئیں۔ میں نے سوچا کہ شاید انہوں نے اپنی کسی سہیلی کو مدعو کیا ہے۔ وہ آنے والی ہے۔ اور چونکہ میں غیر متوقع طور پر طبع چلا آیا ہوں اس لئے ان کا پروگرام دوسرا ہو گیا ہے۔

دوسرے کمرے میں کچھ دیر تک تینوں بہنوں میں سرگوشیاں ہوتی رہی ہیں وہاں وہی ہنسی کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑی بہن یعنی میری بیوی بٹھا ہوا اپنی بہنوں سے مخاطب، مگر دراصل مجھے سناتے کے لئے یہ



بستی ہوئی باہر نکلے۔ مجھے کیا کہتی ہو۔ کہنا ہے تو خود ان سے کہو۔۔۔۔۔ سادات صاحب آج بہت جلدی آگئے تھے۔

میں نے وجہ بیان کر دی کہ اسٹوڈیو میں کوئی کام نہیں تھا اس لئے چلا آیا۔ پھر لونی بیوی سے پوچھا: ”کیا کہنا چاہتی ہیں میری سالیان؟“  
”یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نرگس آدمی ہے۔“

”تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ آئے کیا وہ پہلے کبھی نہیں آئی؟“

میں سمجھا کہ وہ اُس پارسی لڑکی کی بات کر رہی ہے جس کی ماں نے ایک مسلمان سے شادی کر لی تھی اور ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ مگر میری بیوی نے کہا: ”یائے ادا پہلے کب ہمارے ٹاں آئی ہے؟“

”تو کیا وہ کوئی اور نرگس ہے؟“

”ہی نرگس ایکٹرس کی بات کر رہی ہوں؟“

میں نے تعجب سے پوچھا: ”وہ کیا کرتے آدمی ہے یہاں؟“

میری بیوی نے مجھے سارا قصہ سنایا۔ گھر میں ٹیلیفون تھا جسے تینوں بیہنیں

فرصت کے اوقات میں بڑی فراخ دلی سے استعمال کرتی تھیں۔ جب اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی کرتی تھک جاتیں تو کسی ایکٹرس کا نمبر گھما دیتیں وہ بل جاتی تو اس سے آؤٹ پٹ انگ گفت و گو شروع ہو جاتی۔۔۔۔۔ ہم آپ کی بہت مدد میں آج ہی واپس آئی ہیں۔ بڑی شکلوں سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے آپ سے



فرن آئے ہوں گے۔ مگر یہ یقین لو کہ ان سے کچھ مختلف تھیں اس لئے وہ سخت بے چین تھیں کہ ان کی اصلیت جانے اور ان سے ملے جلے چنانچہ جب بھی اُسے معلوم ہوتا کہ ان پر اسرارِ نوکیلوں نے اُسے بلا دیے تو وہ سو کام چھوڑ کر آتی اور بہت دیر تک ٹیلیفون کے ساتھ چپکی رہتی۔

ایک دن رنگس کے پیسہ اصرار پر بلا خٹے ہو گیا کہ ان کی ملاقات ہو کے رہے گی میری بیوی نے اپنے گھر کا پتا بھی طرزِ سبھا دیا اور کہا کہ اگر پھر بھی مکان ٹھنے میں وقت ہو تو بائی کھڑے کن کے پاس کس ہوٹل سے ٹیل فرن کر دیا جائے۔ وہ سب ویاں پہنچ جاتیں گی۔

جب میں گھر میں داخل ہوا۔ بائی کھڑے کن کے ایک استور سے رنگس نے فرن کیا تھا کہ وہ پہنچ چکی ہے مگر مکان خنہیں مل رہا۔ چنانچہ تینوں افراد قفزی کے عالم میں تیار ہو دی تھیں کہ میں بلائے ناگیاں کن طرح پہنچ گیا۔

چھوٹی دوکان خیال تھا کہ میں ناراض ہوں گا بڑی یعنی میری بیوی محض بوکھلائی ہوئی تھی کہ یہ سب کیا سوا ہے.... میں نے ناراض ہونے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے لئے کوئی معقول جواز نہ ملا۔ سارا قہقہہ کافی دلچسپ اور بے حد معصوم تھا۔ اگر کان مچولی کن یہ حرکت صرف میری بیوی سے سرزد ہوئی ہوتی تو بالکل جدا بات تھی۔ ایک سال آدمی گھر والی ہوتی ہے اور یہاں دو سالیاں تھیں پورا گھر ہی ان کا تھا میں جب اُٹھا تو دوسرے کمرے میں خوش ہونے اور تالیاں



میں تم سے کیا کہوں جب ٹیلیفون آتا۔ بھاگی بھاگی جاتی..... میں ہزار پوچھتی یہ کہن ہے جس سے اتنی دیر میسج میسج باتیں ہر ق میں مجھ سے کتنی کہتی ہیں۔ جانتی نہیں کون ہیں۔ مگر ہیں بڑی اچھی۔ دو ایک بلد میں نے بھی ٹیلی فون آٹھایا۔ گفت گو ماشاء اللہ بڑی شائستہ تھی۔ کسی اچھے گھر کی معلوم ہر ق تھیں۔ مگر صاف کرنا کم بہت اپنا نام پتا صاف بتاتی ہی نہیں تھیں۔ کچھ بے لگائی خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی لہلہ انہوں نے بلایا ہے۔ اپنا ایڈریس دے دیا ہے۔ میں نے کہا۔ پاگن ہوئی ہو منہو جا لے کون ہیں۔ کہن خبیث ہیں۔ پر اس نے میری ایک نہ مانی بس پیچھے پڑ گئی چنانچہ مجھے ساتھ آتا ہی پڑا..... خدایا کی قسم اگر معلوم ہو جا کہ یہ آتمیں تبار سے لکھر کی ہیں.....

میں نے بات کاٹ کر دیا۔ تو ساتھ آپ نازل نہ ہوتیں؟  
 جہان بائی کے کتے ہیں دے ہٹے پان میں چوڑی سکرا سٹ پیدا ہوئی ہی کی ضرورت ہی کیا تھی..... میں کیا کہیں جانتی نہیں۔  
 مرحومہ کو اردو ادب سے بڑا شغف تھا میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتی اور پسند کرتی تھیں ان دنوں میرا ایک مضمون ”ساتی“ میں شائع ہوا تھا۔ غالباً ترقی یافتہ قبرستان۔ معلوم نہیں اس کا ذہن کیوں اس طرف پھا گیا خدایا کی قسم منہو..... بہت خوب لکھتے ہو۔ ظالم کیا طنز کیا ہے اس مضمون میں..... کیوں بے لگائی اس دن کیا حال ہوا تھا میرا یہ مضمون پڑھ کر؟

مگر زگس اپنی نادریدہ بسیلیوں کے شعلہ سوز رہی تھی۔ اضطراب میرے  
بہر میں اس نے اپنی ماں کے کباڑ چلو ہائی۔

جہان بائی مجھ سے مطالب ہوئی تہ چلو جانی تہ

مگر کس ہی تھا۔ موثر اشارت ہوئی اور ہم سب چلے گئے۔ اوپر باگن سے تینوں  
بہنوں نے ہیں دیکھا۔ چھوٹی دوکان سے خوشی کا بڑا حال ہوتا تھا خدا معلوم آپس  
میں کیا کھڑپھڑ کر رہی تھیں۔ جب ہم دروازہ پر پہنچے تو عجیب و غریب طریقے پر سب  
کی عزائم ہوئی زگس اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں داخل گئی اور میں میری  
بیوی اور جہان بائی وہیں بیٹھ گئے۔

بہت دیر تک مختلف زاویوں سے کان چولی کے سلسلے پر تھمرو کیا گیا میری بیوی  
کی بوکھا ہٹ جب کسی قدر کم ہوئی تو اس نے میزبان کے فرائض سرامجام  
دینے شروع کر دیئے۔

میں اور جہان بائی غلامانہ سرس کے حالات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے  
پان کھانے کے معاملے میں بڑی خوش ذوق تھی۔ ہر وقت اپنی پسند نبیساتھ  
رکھتی تھی۔ بڑی دیر کے بعد موقع ملا تھا اس لئے میں نے اس پر خوب تاتھ  
صاف کیا۔

زگس کو میں نے ایک مدت کے بعد دیکھا تھا۔ دس گیارہ برس کی تھی تب جب  
میں نے ایک دو مرتبہ غلوں کی ٹائشیں غلطی میں آئے اپنی ماں کی انگلی کے ساتھ



## زگس

مکھڑا کنوئٹ کی چل دیواری تک محدود تھا فلم اسٹوڈیو میں کیا ہوتا ہے وہاں کیا جیے اس سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ زگس بھول گئی تھی کہ وہ فلم سٹوڈیو پر دسے پرجوں کی اماںیں بکتی ہیں اور اس کی بہیلیاں بھی یہ بھول گئی تھیں کہ زگس اسکین پر بُری بُری حرکتیں کرنے والی اکیٹرس ہے۔

میری میری جو عمریں زگس سے بڑی تھی اب اس کی آمد پر بالکل بدل گئی تھی اس کا سلوک اس سے الیا ہی تھی۔ جیسا اپنی چھوٹی بہنوں سے تھا۔ پہلے اُس کو زگس سے اس طے دلچسپی تھی کہ وہ فلم اکیٹرس ہے پر دسے پر بڑی محفل سے نت نئے مردوں سے محبت کرتی ہے۔ ہنستی ہے آہیں بھرتی ہے، کہہ کرے لگاتی ہے اب اسے خیال تھا کہ وہ کتنی چیزیں دکھائے۔ جیسا ٹھنڈا پانی نہ پیئے زیادہ فلموں میں کام نہ کرے۔ اپنی صحت کا خیال رکھے اب اس کے نزدیک زگس کا فلموں میں کام کرنا کوئی میووب بات نہیں تھی۔

میں، میری بیوی، اور جڈن باٹی اور حصار دھکی باتوں میں مشغول تھے کہ آپا سعادت آگئیں۔ میری ہم نام ہیں اور بڑی دلچسپ چیز میں تصنع سے لاکھوں میں دور.... جب معمول وہ اس انداز سے آئیں کہ جڈن باٹی سے اُلکھو متعارف کرانے کا ہیں موقع ہی نہ ملا۔ اپنے دوڑھانی من کے بوجھ کو صوفے پر بچھا کرتے۔ ہرے بولیں مے صفو جان! تمہارے بھائی جان سے میں نے لاکھ کہا تھا کہ الین مردار سوڑ نہ فریدو... گرا نہیں نے ایک نہ سنی... وندم چلی ہوگی۔



کہ ہانپنے لگی اور کھڑی ہو گئی۔ اب کھڑے بیٹھل مادر ہے میں میں نے کہا آپ جاہلیے۔ میں تو صفو کے پاس جیتی ہوں۔

جتن باقی ڈالنا کسی نواب کی ہانت کر رہی تھیں جو بہت عیاش تھا آپاسادت کی وجہ سے یہ بات مکمل دہر سکی۔ جب پھر شروع ہوئی تو آپاسادت نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ کاشیا واڈ کی قریب قریب تمام ریاستوں اور ان کے قواہل کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ کیونکہ ریاست مانڈول کے نواب اٹھان میں بیا ہی گئی تھیں۔

جتن باقی اپنے پیشے کی وجہ سے تمام دالیاں ریاست کو اچھی طرح جانتی پہانتی تھیں۔ باتوں باتوں میں ایک برہمن ریاست خود کم کی طوائف کا ذکر چھڑ گیا۔ آپاسادت شروع ہو گئیں۔ ”خدا ان سے محفوظ رکھے۔ جن کے ساتھ چھشت ہیں۔ اس کو دین کا رکھتی ہیں نہ دنیا کا۔ دولت برباد۔ صحت برباد۔ عورت برباد۔ معطر طہن میں تمہیں کیا بتاؤں، سو بیادوں کی ایک بیلدی ہے یہ طوائف۔“

میں اور میری بیوی سخت پریشان کہ آپاسادت کو کیسے دیکھیں۔ جتن باقی بڑی فراخ دل سے آپاسادت کی ہن میں ہن میں غلامی تھی اور ہم دونوں پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے ایک دو بار میں نے ان کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ اور زیادہ جوش میں آگئیں۔ جی بھر کے گالیاں دینے لگیں۔ لیکن یک لخت انہوں نے جتن باقی کی طرف دیکھا ان کے سفید گوشت بھرے چہرے پر ایک

عجیب و غریب ٹھہر ٹھہری پیدا ہوئی۔ ان کی ناک کی کیں کا سیرا اردن کی جنبش کے ساتھ دو تین دفعہ بڑی تیزی سے چمکا اور پھر ان کا منہ کھلا۔ فوراً سے اپنی دافوں پر دو ہتھ مار کر انہوں نے تنہا تے مہٹے لیے ہیں جتن بائی سے کہا : آپ ؟

..... آپ تو جتن..... آپ جتن بائی ہیں نا ؟

جتن بائی نے بڑی شناخت سے جواب دیا : جی ہاں !

آپا سادات کا منہ اور زیادہ کھلا..... وہ..... تو آپ..... میرا مطلب ہے کہ آپ تو بہت ادنیٰ طوائف ہیں..... کیوں صفو جان ؟ صفو جان برف ہو گئی۔ میں نے جتن بائی کی طرف دیکھا اور سکا لایا..... میرا خیال ہے بہت ہی وابہیات قسم کی سکرا ہٹ تھی۔ جتن بائی نے لیوٹ نکال کر جیسے کھٹی بات ہی نہیں ہوئی اور اسی بڑی دیانتت خود قسم کی طوائف کے بقایا سادات بیان کرتے شروع کر دیئے جن کا ذکر چھوڑنے پر آپا سادات کو کھپڑ دینا پڑا ہے۔

جتن بائی کی کوشش کے باوجود بات دھبی۔ آپا سادات کو اپنی غلطی کا اور میں اپنی خفت کا بہت ہی شدید احساس تھا مگر جب لوکیاں لگیں تو قضا کا ٹکڑہ دور ہو گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد زگس سے فرمائش کی گئی کہ وہ گانا سنائے۔ اس پر جتن بائی نے کہا : میں نے اس کو موسیقی کی تعلیم نہیں دی مگر میں بالواس کے خلاف تھے اور سچ پوچھئے تو مجھے بھی پسند نہیں تھا۔

تھوڑا بہت گانے سن کر لیتی ہے : اس کے بعد وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی

”سنادو جے لی..... جیسا بھی آتا ہے سنا دو۔“

زگس نے بڑی ہی مصمصا نہ بے تکلفی سے گانا شروع کر دیا۔ پہلے بچے کی کن ٹری تھی آواز میں دس نہ لونیج، میری چھوٹی سالی اُس سے لاکھوں دس بے بہتر گاتی تھی مگر فرائشس کی گئی تھی اوروہ بھی بڑی پراسرار اس لئے دو تین منٹ تک اس کا گانا برداشت کرنا ہی پڑا۔ جب اُس نے ختم کیا تو سب نے تریف کی میں اور آپا سعادت خاموش رہے تھوڑی دیر کے بعد جیدان بائی نے رخصت چاہی۔ لڑکیاں زگس سے گلے میں۔ دوبارہ ملنے کے وعدے دے دیے ہوئے۔ کچھ گھس گھس میں ہوئی اور بھارے سہان چلے گئے۔

زگس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد ادھ کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لڑکیاں ٹیلی فون کرتی تھیں اور زگس ابھی موٹر میں چلی آتی تھی۔ اس آمدورفت میں اس کے ایکٹرس ہونے کا احساس قریب قریب مٹ گیا۔ وہ لڑکیوں سے اور لڑکیاں اُس سے بولتی تھیں جیسے وہ ان کی بہت پرانی ہیلی ہے یا کوئی دشتہ داد ہے لیکن جب وہ چلی جاتی تو کبھی کبھی تینوں بہنیں اس استعجاب کا اظہار کرتیں۔ خدا کی قسم عجیب بات ہے کہ زگس بالکل ایکٹرس معلوم نہیں ہوتی۔

اس دوران میں تینوں بہنوں نے اس کی ایک تازہ فلم دکھائی جس میں تلا ہے کہ وہ اپنے بیرو کی محبوبہ تھی جس سے وہ پیار کی باتیں کرتی تھی اور کسے

عجیب عجیب گھبراہٹ سے دیکھتی تھی اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوتی تھی اس کا ہاتھ دباتی تھی میری بیوی کہتی تھی کہ بہت اُس کے فراق میں کیسی لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی۔ جیسے سچ پچے اُس کے عشق میں گرفتار ہے اور اُس کی چھوٹ دوہیں اپنے کندھارے ایکٹنگ سے نا آشنا دل میں سوچتیں تھ اور کہ وہ ہم سے پوچھ رہی تھی کہ گروہ کی ٹرن کیسے بنائی جاتی ہے ؟

زگس کی اداکاری کے متعلق میرا خیال بالکل مختلف تھا وہ قطعی طور پر جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی نہیں کرتی تھی۔ محبت کی بعض کبھی طرح چلتی ہے یہ انٹری انگلیاں کیسے محسوس کر سکتی تھیں عشق کی دوڑ میں تھک کر ہٹا ہٹا اور اسکول کی دوڑ میں تھک کر سانس کا بھول جانا وہ بالکل مختلف چیزیں ہیں میرا خیال ہے کہ خود زگس بھی اس کے فرق سے آگاہ نہیں تھی اس کے شروع شروع کی فلموں میں چنانچہ دقیقہ دمن لگائیں فوراً معلوم کر سکتی ہیں کہ اس کی اداکاری کیسے قریب کاری سے مقرر تھی۔

تصنع کا یہ کہاں ہے کہ وہ تصنع معلوم نہ ہو۔ لیکن زگس کے تصنع کی بنیادیں چونکہ تجربے پر استوار نہیں تھیں اس لئے اس میں یہ غریبی نہیں تھی۔ یہ صرف اس کا خلوص تھا وہ بے پناہ خلوص جو اسے اپنے شوق سے تھا کہ وہ جذبات و احساسات کے نہایت ہی خام اظہار کے باوجود اپنا کام نبھا جاتی تھی علیرود تجربے کے ساتھ ساتھ وہ بہت پختگی اختیار کر چکی ہے اب اس کو عشق کی دوڑ میں



مومن یا بوا ایک بڑے رئیس زادہ تھے جتن بائی کے گنگے کی تانوا اور مرکبوں میں ایسے اُبھے کہ وہیں دنیا کا ہوش نہ رہا۔ خواہ دولت تھے، صاحب ثروت تھے، اعلیٰ پائے تھے۔ صحت مند تھے مگر یہ سب دولتیں جتن بائی کے دور پر مٹیں اور گداگر بن گئیں۔ جتن بائی کے نام کا آس نہ مائے ہیں ڈنکا بھیتا تھا، بڑے بڑے خواب اور راجے آس کے محروم پر سونے اور چاندی کی بادشہس برساتے تھے مگر جب بادشہیں قسم جاتی ہیں اور آسمان نکھر جاتا تو جتن بائی اپنے مومن کو اٹھا کر سینے سے لگالیتی کہ اسی مومن کے پاس اس کا تھن تھا۔

مومن بابر تارم آخر جتن بائی کے ساتھ تھے وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس سطرے کو وہ راجوں اور نوابوں کی دولت میں غریبوں کے خون کی بو سڑنگہ جلی تھی اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُن کے شوق کا دھارا ایک ہی سمت نہیں بہتا۔ وہ مومن یا بوا سے محبت کرتی تھی کہ وہ اس کے بچوں کا باپ تھا۔

خیالات کی دھوپ میں جانے کہ صبر بہ گیا۔ نرگس کو مہر جال اکیر میں بننا تھا چنانچہ وہ بن گئی اس کے باہر عروج تک پہنچنے کا راز جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا انھوں نے جو قدم بہ قدم منزل بہ منزل اس کے ساتھ رہا ہے۔

ایک بات جہاں طاقتوں میں غلامی میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ نرگس کو اس بات کا احساس تھا کہ جن لوگوں سے وہ ملتی ہے وہ جدا قسم کے آب و گل سے بنی ہیں وہ آں کے پاس آتی تھیں۔ گفتگو ان سے معصوم معصوم

باقی کرتی تھی۔ گروہ اُن کو اپنے گھر مدعو کرنے میں ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس کرتی تھی اس کو شاید یہ ڈر تھا کہ وہ اس کی دعوت ٹھکرا دیں گی یہ کہیں اُگلی کردار اس کے یہاں کیے جاسکتی ہیں میں ایک دن گھر پر موجود تھا کہ اس نے سرسری طور پر اپنی سہیلیوں سے کہا: اب کبھی تم بھی یہاں سے گھر آؤ؟

یہ سُن کر تینوں بہنوں نے ہنسنے ہی بنیڈے پنی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا وہ شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ ہم نرگس کی یہ دعوت کیسے قبول کر سکتی ہیں لیکن میری بیوی چونکہ میرے خیالات سے واقف تھی اس نے ایک روز نرگس کے سہیم اصرار پر اُس کی دعوت قبول کر لی گئی اور مجھے بتاتے بغیر تینوں اُس کے گھر چلی گئیں۔

نرگس نے اپنی کار صبح دی تھی جب وہ بجے کے خوبصورت ترین مقام میرین ڈرائنگ کے اُس ٹیلیٹ میں پہنچیں۔ جہاں نرگس بہتی تھی تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آمد پر خاص انتظام کیا گئے تھے، موہن بابو ادا اُس کے دو فوجوان راکوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ وہ گھر میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ نرگس کی سہیلیاں آ رہی ہیں مردانہ کردار کو جس اُس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی جہاں ان معزز جہانوں کو بٹھا دیا گیا تھا اور جتن بائی تھوڑی دیر کے لئے رسمی طور پر ان کے پاس بٹیتی اور اندر چلی گئی۔ وہ اُن کی معصوم گفت گوئیوں میں خاموش نہیں ہونا چاہتی تھی۔

تینوں بہنوں کا بیان ہے کہ نرگس اُن کی آمد پر سہولی نہ سہاتی تھی وہ اس قدر

عروش غمی کہ بار بار گھبراہی جاتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کی خاطر داری میں اس نے بڑے جوش کا اظہار کیا۔ پاس ہی پیرٹون ڈبیری تھی اس کے ٹک شیک "شہود تھے گاڑی میں جا کر زرگس خود یہ مشروب بگ میں تیار کر کے لائی کیونکہ وہ یہ کام کر کے سپرد کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے کہ بھروسے کے اندر آنے کا احتمال تھا۔

خاطر داری کے اس جوش و غروش میں زرگس نے اپنے نئے سیٹ کا ٹکاس توڑ دیا۔ مہانوں نے اٹکوس کا اظہار کیا تو زرگس نے کہا بھگوتی بات نہیں بنی پی غصے ہوں گی مگر ڈبیری ان کو چپ کرادیں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

موسن بالبو کو اس سے اورد اس کو موسن بالبو سے بہت محبت تھی۔ "ٹک شیک" پلانے کے بعد زرگس نے مہانوں کو اپنا اہم دکھایا جس میں اس کے مختلف ناموں کے اشل تھے۔ اس زرگس میں جو ان کو یہ فورٹ دکھا رہی تھی اوداس زرگس میں جو ان تصویروں میں موجود تھی کتنا فرق تھا۔ تینوں بیٹیں کبھی اس کی طرف دیکھتیں اود کبھی اہم کے اطلاق کی طرف اود اپنی حیرت کا میں اظہار کرتیں۔

"زرگس۔ تم یہ زرگس کیسے بن جاتی ہو؟"

زرگس جواب میں صرف مسکراتی۔

میری بیوی نے مجھے بتایا کہ گھر میں زرگس کی ہر حالت، ہر اداسی، ہر پیرٹون تھا۔ اس میں وہ شوخی، وہ طرازی، وہ نیکھاپن نہیں تھا جو اس کے سراپا میں پردے پر نظر آتا ہے وہ بڑی ہی گھر پر قسم کی رنگی تھی میں نے خود ہی محسوس



کیا تھا۔ لیکن جانے کیوں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب و غریب قسم کی اداسی تیرتی نظر آتی تھی۔ مجھے کوئی لاوارث لاش، تالاب کے شہرے پانی پر مہا گیسٹے کے جہازوں سے اور تماشہ پذیر ہے۔

یہ فطری طور پر طے تھا کہ شہرت کی جس منزل پر نرگس کو پہنچنا تھا وہ کچھ زیادہ دور نہیں۔ تقدیر اپنا فیصلہ اس کے حق میں کر کے تمام متعلقہ کاغذات اس کے حوالے کر چکی تھی لیکن پھر وہ کیوں مغموم تھی کیا غیر شعوری طور پر وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ عشق و محبت کا یہ مصنوعی کیمیں کیلئے ایک دن وہ کسی ایسے لون و دوق صحرائی میں نکل جائے گی۔ جہاں سراسر ہی سراسر بھول گئے پیاس سے اس کا حلق سوکھ رہا ہوگا اور آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے تھنوں میں صرف اس لئے دودھ نہیں اُترے گا کہ وہ یہ خیال کریں گے کہ نرگس کی پیاس محض بناوٹ ہے زمین کی کوکھ میں پانی کی بوندیں اور زیادہ اندر کو سمٹ جائیں گی اس خیال سے کہ اُس کی پیاس صرف ایک دکھاوا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود نرگس بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ میری پیاس کیسے چھوٹی پیاس تو نہیں۔

اتنے برس گزر جانے پر میں اب اُسے پردے پر دیکھتا ہوں تو مجھے اس کی اداسی کچھ مضمحل سی نظر آتی ہے پہلے اس میں ایک مستعد جستجو تھی لیکن اب یہ جستجو بھی اداس اور مضمحل ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب خود نرگس ہی

دے سکتی ہے۔

تینوں بہنیں جو عمر جردی جردی نرگس کے اہل گھنی تھیں۔ اس لڑے وہ زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھ سکیں۔ چھوٹی دو کو یہ اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو مجھے اس کا علم ہو جائے چنانچہ انہوں نے نرگس سے رخصت چاہی۔ اور واپس گھر آ گئیں۔

نرگس کے تعلق وہ جب بھی بات کرتیں۔ گھوم پھر کر اس کی شادی کے مسئلے پر آ جاتیں۔ چھوٹی دو کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ کب اور کہاں شادی کرے گی۔ بڑی جس کی شادی ہوسے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ اہل کیسی بنے گی۔

کچھ دیر تک میری میری نے نرگس سے اس خفیہ ملاقات کا حال چھپائے رکھا۔ آخر ایک روز بتا دیا۔ میں نے مصنوعی حشگی کا اظہار کیا۔ تو اس نے سچ سمجھے تھیں مجھ سے صفائی مانگی اور کہا۔ واقعی ہم سے غلطی ہوئی۔ مگر خدا کے لئے اب آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے گا۔

وہ چاہتی تھی۔ کہ بات ابھی تک یہ ہے۔ ایک ایکٹرس کے گھر جانا تینوں بہنوں کے نزدیک بہت محبوب بات تھی۔ وہ اس حرکت کو چھپانا چاہتی تھیں چنانچہ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی ماں سے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ بالکل تنگ خیال نہیں تھی۔

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ان کی وہ حرکت حرکتِ مذموم کیوں تھی۔ اگر

وہ نرگس کے ان گئی تھی تو اس میں برائی ہی کیا تھی۔ اور کاری سبب کمبوں بھی جاتی ہے۔ کیا ہمارے اپنے خاندان کے حلقے میں ایسے افراد نہیں ہوتے۔ جن کی سادی عمر فریب کاریوں اور طبع کاریوں میں گزر جاتی ہے۔ نرگس نے تو ادا کاٹا کر اپنا پیٹ بنایا تھا۔ جس نے اس کو راز بنا کر نہیں رکھا تھا۔ کتنا بڑا فریب جس میں یہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔

اس معنوں کے آغاز میں میں نے ایک خط لکھا کہ جسے نقل کیا ہے جو مجھے نسیم سلیم نے لکھا تھا۔ اب اس کی طرف لوٹتا ہوں۔ دراصل سادی بات ہی اسی سے چلی تھی۔

چونکہ مجھے نرگس کو اس کے گھر میں مرنے کا اشتیاق تھا۔ اس لئے میں معروفہ مونس کے باوجود مسٹر سلیم اور ان کے معاصروں کے ساتھ میرین ڈرائیو چلا۔ چاہئے تو یہ تھا۔ کہ میں فون کے ذریعے سے جیدن بائی کو اپنی آمد سے مطلع کر دیتا اور یہ بھی معلوم کر لیتا کہ نرگس فارغ بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں عام زندگی میں بھی چمکے ایسے سکھات کا قائل نہیں۔ اس لئے بغیر اطلاع دیے وہاں جا دھکا جیدن بائی باہر برآمدے میں بیٹھی سردی سے چھایا کاٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو بلند آواز میں کہا: "اورہ منٹو۔ آؤ۔ بھائی آؤ۔ پھر نرگس کو آواز دی۔

بے بی۔۔۔۔۔ تمہاری سہیلیاں آئی ہیں؟

میں نے قریب جا کر اسے بتایا کہ میرے ساتھ سہیلیاں نہیں، سہیلے ہیں؟

جب میں نے نواب چٹاری کے داماد کا ذکر کیا تو اس کا بوجھل گیا؟ بلاوا نہیں؟  
زرگس دوڑی دوڑی آئی۔ تو اس سے کہا: ”تم اندر جاؤ بے بی۔ منٹو صاحب کے  
دوست آئے ہیں۔“

مدن بائی نے میرے دوستوں کی کچھ اس اعاز سے آؤ بھگت کی۔ جیسے وہ  
مکان دیکھنے اور پسند کرنے آئے تھے۔ وہ بے لکھی جو میرے لئے مخصوص تھی۔  
غائب ہو گئی۔ بیٹھو تشریف رکھے میں تبدیلی ہو گیا۔ کیا یہ ہو گے۔ کیا نوٹن فرمائیے گا  
بن گیا۔ تم آپ ہو گیا۔ اور میں خود کو چند محسوس کرنے لگا۔

میں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی آمد کا متعا بیان کیا۔ تو مدن بائی نے  
بڑے ہی پُر تعصّب اعاز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے میرے ساتھیوں سے  
کہا: ”بی بی سے عطا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ کیا بتاؤں کئی دنوں سے غریب کی طبیعت ناساز  
ہے۔ دن رات کی شوٹنگ نے اسے بے حد مضطرب کر دیا ہے۔ بہت سنج کرتی ہوں  
کہ ایک روز آرام کرو۔ مگر شوق ایسا ہے کہ نہیں سستی محبوب نے بھی کہا کہ بیٹیا کوئی  
حرج نہیں۔ تم ریسٹ کرو۔ میں شوٹنگ بند کر دیتا ہوں۔ مگر مانی۔۔۔۔۔  
آج میں نے زبردستی روک لیا۔۔۔۔۔ زکام سے نڈھال ہو رہی ہے۔ غریب!“

یہ سُن کر میرے دوستوں کو غلا ہرے۔ بہت مایوسی ہوئی۔ زرگس کی ایک  
جھلک وہ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے دیکھ چکے تھے۔ اور اس کو مفضل طور پر دیکھنے کے لئے  
بجئے ناب تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا۔ کہ بے بی کی طبیعت ناساز ہے تو انہیں بڑی

کوٹ ہوئی۔ جتن بانی ادھر ادھر کی باتیں کئے جاتی تھیں۔ جن سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد جانیاں لینے لگیں گے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نرگس کی ناسازشی طبیعت کا بہانہ محض رسمی ہے چن چن میں نے جتن بانی سے کہا۔ بے بی کوزگت تو ہوگی، مگر یہ اتنی دور سے آئے ہیں۔ ذرا بلا بھیجئے۔

آمدتین چار مرتبہ کہلانے کے بعد نرگس آئی۔ سب نے اٹھ کر قیاماً اسے سلام کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ نرگس کا داخلہ فلمی تھا۔ اس کا سلام کا جواب دینا فلمی تھا اس کا بیٹھنا اٹھنا فلمی تھا۔ اُس کی گفتگو فلمی تھی جیسے سیٹ پر مکالمے بول رہی ہو۔ اور میرے ساتھیوں کے سوال جواب بڑے ہی قریباً نہ قسم کے اوٹ پٹانگ تھے۔

”آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی؟“

”جی ہاں آج ہی بلجئے پہنچے ہیں۔“

”کل پرسوں واپس چلے جائیں گے؟“

”آپ ماشاء اللہ اس وقت ہندوستان کی چوٹی کی اداکارہ ہیں؟“

”آپ کے ہر فلم کا ہم نے پہلا شو دیکھا ہے۔“

یہ تصویر جو آپ نے دی ہے میں اسے اپنے اہم میں لگاؤں گا!

اس دوران میں سرہن باورچی آگئے۔ مگر وہ خاموش بیٹھے رہے کبھی کبھی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گھا کر ہم سب کو دیکھ لیتے۔ اور ہر خدا جلنے کس سوچ

میں فرق ہر ملے ۔

سب سے زیادہ باتیں جتن بانی نے کیں۔ ان میں اس نے ملاقاتیں پر مجھے راضی الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ وہ ہندوستان کے ہر راجے اور ہر نواب کو اندر باہر سے اچھی طرح جانتی ہے۔ نرگس نے جتنی باتیں کیں بہت محترمہ اور بناوٹ سے سرور تھیں۔ اس کی ہر حرکت اور ہر ادا سے یہ صاف منترشح تھا کہ وہ اپنے مٹے والوں کو بے چیزیں پلیٹ میں ڈال کر بڑے تکلف سے پیش کر رہی ہے تاکہ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ وہ دلی طور پر معذرت و تشکر تھے۔ مگر اس استنان و تشکر سے نرگس مشکفی نہیں تھی۔ وہ غالباً جواب میں تعصّب ہی کی طالب تھی۔

یہ ملاقات کچھ بہت ہی چپکی رہی میرے لئے بھی اور میرے ساتھیوں کے لئے بھی میری موجودگی میں وہ کھل کر احمقانہ باتیں نہیں کر سکے تھے اور میں ان کی موجودگی کے باعث بہت ہی تکلیف دہ گھٹن محسوس کرتا رہا تھا۔ بہر حال نرگس کا دوسرا رنگ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔

سلیم اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے روز پھر نرگس کے ہاں گئے۔ اس کی اطلاع انہوں نے مجھے خصوصی۔ میرا خیال ہے اس ملاقات کا رنگ کچھ اور بھی ہرگز منتخب کے ساتھ جس جنگ کا ذکر تسنیم نے اپنے خط میں کیا ہے وہ مجھے بالکل یاد نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت وہاں موجود ہوں۔ کیونکہ جتن بانی کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور مجھے کے اکثر شعر اپنا کلام سنانے کے لئے

وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نمشب سے ان کی شاعری ہی پر اختلاف رائے کے باعث ہلکی سی چچ ہو گئی ہو۔

نرگس کا ایک اور دلچسپ رنگ میں نے اس وقت دیکھا جب اشوک میرے ساتھ تھا۔ جتن بانی کوئی اپنا ذاتی قلم تیار کرنے کا ارادہ کر رہی تھی اس کی خواہش تھی کہ اشوک اس کا ہیرو ہو۔ اشوک حسب عادت اکیلا جانے سے گھبراتا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

دوران گفتگو میں کئی نکتے تھے۔ کاروباری نکتے، دوستانہ نکتے، خوشامدی نکتے یہ نکتے بڑے ہی دلچسپ طریقے پر آپس میں گڑلے ہوتے رہے جتن بانی کا انداز کبھی بزرگانہ ہوتا تھا۔ اور کبھی ہم عصرانہ۔ وہ کبھی پروڈیوسر بن جاتی اور کبھی نرگس کی ماں۔ ایسی ماں جو اپنی بیٹی کی قدر و قیمت بڑھانا چاہتی ہے مگر ہاں با بوسے کبھی کبھی دل میں ماں طالی جاتی تھی۔

لاکھوں روپے کا ذکر آیا۔ وہ جو خرچ ہو چکے تھے۔ خرچ ہونے والے تھے اور جو خرچ کیے جا چکے تھے۔ سب کا حساب انگلیوں پر گنوا یا گیا۔ نرگس کا یہ انداز تھا کہ دیکھو اشوک، مانتی ہوں کہ تم مجھے ہر شے ایکٹرو ہو۔ تمہاری دھاک میٹھی ہوئی ہے۔ مگر میں بھی طرح کم نہیں۔ تم مان جاؤ گے کہ میں اداکاری کے میدان میں تبادلا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ چنانچہ اس کی تمام گوششیں اس نقطے پر مرکوز نہیں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اس کے اندر ضرورت بھی بیدار ہو جاتی تھی کہ

وہ اشوک سے یہ کہتی معلوم ہوتی: تم پر ہزاروں ٹوکیاں فریقہ ہیں۔ لیکن میں اسے کیا سمجھتی ہوں۔ میرے بھی ہزاروں چاہنے والے موجود ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی مرد سے پرچہ لو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس چیلنج کی جکی سی جھلک بھی ہوتی: ہو سکتا ہے تم ہی مجھ پر مڑنا شروع کر دو!

اور جیدن بانی کبھی مصالحت کی طرف جھک جاتی کہ نہیں، اشوک تم اور کبھی دونوں پر دیتا مرتی ہے۔ اسی لئے تم میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک ساتھ پیش کروں تاکہ ایک قتل عام ہو۔ اور ہم سب خوب فائدہ اٹھائیں۔ کبھی کبھی وہ ایک اور انداز اختیار کر لیتی اور مجھ سے غلطی ہوتی۔

”غٹو، اشوک آتا بڑا اکیٹر بن گیا ہے۔ لیکن خدا کی قسم بہت ہی نیک آدمی ہے۔ بڑا کم گو بڑا ہی شریلا۔ خدا عز و جل دانا کرے۔ میں جو فلم شروع کر رہی ہوں اس میں اشوک کے لئے خاص طور پر میں نے کیریکٹر لکھوایا ہے۔ تم سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے“۔

میں یہ کیریکٹر سننے بغیر ہی خوش تھا۔ اس لئے کہ جیدن بانی کا کیریکٹر خود بہت ہی دلچسپ تھا۔ اور نرس جو رول ادا کر رہی تھی۔ وہ تو اور بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ میرا خیال ہے اگر پردے پر وہ حالات پیش کئے جاتے اور اس سے کہا جاتا کہ اشوک سے مل کر تمہیں ایسی گفتگو کرنا ہے تو وہ کبھی اتنی کامیاب نہ ہوتی جتنی کہ وہ اس وقت تھی۔



باتوں باتوں میں ثریا کا ذکر آیا، تو جہن بائی نے ناک ہوں چڑھا کر اس میں اور سارے کے سارے خاندان میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے، ثریا کی عیب جوئی وہ ایک فرض کے طور پر کرتی تھی، اس کا گلا خراب ہے۔ بے ہوشی ہے اتنا لگا ہے، دانت بڑے واسیات ہیں، ادھر ٹریا کے اہل جاؤ تو نرگس اور جہن بائی بہر علل جواہی شروع ہو جاتا تھا، ثریا کی نانی جو حقیقت میں اس کی ماں تھی حقے کے بچنے والا، اڑا کر دونوں کو خوب کستی تھی، نرگس کا ذکر آتا تو وہ بڑا سامنے بنا کر سر اٹھوں کے انداز میں جگت کرتی، ہنر دیکھو جیسے گلا سٹرا پیتا ہوتا ہے۔

مورن باہر کی خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسند چکی ہیں، جہن اپنے دل کی بقایا حسرتیں اور تمنائیں لیے منوں مٹی کے نیچے دفن ہے اس کی بے، نرگس نفع اور بناوٹ کے آخری زینے پر پہنچ کر صوم نہیں اور اور ہر ایک رہی ہے یا اس کی اناس اور اس آنکھیں نیچے سب سے پہلے زینے کو دیکھ رہی ہیں جب اس نے گھٹٹیوں چنا لیکھا تھا، وہ خیر و کن روشنی میں تاریک ترین سائے کی تلاش میں ہے، یا تاریک ترین سائے میں روشنی کی غمی سی کرن ٹول رہو ہے؟۔ روشنی اور سائے کا تانا بانا ہی زندگی ہے اور اس تانے بانے کی حکامی غمی زندگی جس میں کبھی ریسا بچ، ایسا خم بھی آ جاتا ہے، جب روشنی روشنی رہتی ہے دمایا، سایہ !

# کشت زعفران

’لاٹس اورن — تین اون — کیمرو ریڈی — شارٹ مشرنگ تپ!‘  
’شارڈ!‘

’سین قرٹی فور — ٹیک ٹن!‘  
’نیلادی آپ کچھ فکر کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے!‘  
’کٹ کٹ؟‘

’لاٹس اورن ہرٹس — وی ایچ ڈی بی نے رائفل ایک طرف رکھتے ہوئے  
بڑے اطمینان سے اشوک سے پوچھا: ’اوکے مشرنگنگولی؟‘  
اشوک نے جوہل بھن کر راکھ ہونے کے قریب تھا۔ قبر کو دنگاہوں سے  
ظہار میں دیکھا اور زہر کے چند بڑے بڑے گونٹ جلدی جلدی پنی کہ چہرے

پر مصنوعی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈیساٹی سے کہا: "ونڈرفل! پھر اس نے  
معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا: "کیوں نمٹو؟"  
میں نے ڈیساٹی کو گلے لگا لیا: "ونڈرفل!"

ہمارے چاروں طرف لوگ اپنی اپنی سببی کا بہت بڑی طرح گلا گھونٹ  
رہے تھے۔ ڈیساٹی بہت خوش تھا۔ چونکہ اس نے بہت دیر کے بعد میرے  
منہ سے اپنی اس قدر پُر جوش تعریف سنی تھی۔ دراصل اشوک نے کچھ عرصہ پہلے  
مجھے منہ کر دیا تھا کہ میں اپنی بھتیجا بیٹ کا اظہار ہرگز نہ کر دوں۔ کیونکہ اسے  
امیر شہ تھا کہ ڈیساٹی بوکھلا جائے گا۔ اور سارا دن غارت کر دے گا۔  
جب چند لمحات گزر گئے تو ڈیساٹی نے مکالمہ آموزہ ڈکشن سے کہا:  
"ڈکشن صاحب! نکسٹ ڈائلاگ؟"

یہ سن کر اشوک جو کہ "آٹھ دن" نامی فلم ڈائریکٹ کر رہا تھا، مجھ سے مخاطب  
ہوا۔ نمٹو، میرا خیال ہے پہلا ڈائلاگ ایک دفعہ اور سے میں؟  
میں نے ڈیساٹی کی طرف دیکھا: "کیوں ڈیساٹی صاحب! — میرا  
خیال ہے اس دفعہ اور بھی ونڈرفل ہو جائے؟"

ڈیساٹی نے گجراتی انداز میں اپنا سر ہلایا: "ہو — تو نے برا ہی گرا کر م  
سنا ہے؟"

دُعا رام چلایا: "لائٹس اون!"

لائٹس روشن ہوئیں۔ ڈیساٹی نے رائفل سنبھالی۔

ڈکٹھ جھٹ سے ڈیساٹی کی طرف پیکا اور مکالموں کی کتاب کھول کر کچھ لگا۔ مسٹر ڈیساٹی۔ ذرا وہ ڈراڈاگ یاد کر لیجئے؛

ڈیساٹی نے پوچھا، کون سا ڈراڈاگ؟

ڈکٹھ نے کہا: دی جی آپ نے آنا دیکھ کر قتل بولا تھا۔ ذرا اُسے دہرا لیجئے۔

ڈیساٹی نے رائفل کندھے پر جھاتے ہوئے بڑے سنگین اعتماد سے کہا

مجھے یاد ہے۔

ڈکٹھ نے مجھے اشارہ کیا۔ "منٹو صاحب ذرا آپ سُن لیجئے؛

میں نے ڈیساٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے غیر سنجیدہ ہجے میں کہا "اں، تو وہ کیا ہے ڈیساٹی صاحب — نیلا دیوی، آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔

میں نے بھی پشاور کا پانی پیا ہے؟

ڈیساٹی نے اپنے سر پر پشاور سیٹنگی کا زاویہ درست کیا۔ اور دیرا (فلم میں

نیلا دیوی) سے مخاطب ہو کر کہا: "نیلا دیوی، آپ کوئی پشاور نہ کیجئے، میں نے

بھی آپ کا پانی پیا ہے۔"

دیرا اس قدر بے تماشا ہنس کر ڈیساٹی ڈر گیا: کیا ہوا مس دیرا؟

دیرا ساڑھی کے آپٹکل میں ہنسی دباتی سیٹ سے باہر چلی گئی۔ ڈیساٹی نے

تشریش کا ہر کرتے ہوئے ڈکٹ سے پوچھا : کیا بات تھی ؟  
 ڈکٹ نے اپنا ہنسی سے اُبتا ہوا منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے ڈیوائی  
 کی پریشانی دور کرنے کے لئے کہا : ننگی میری بس۔ کھانسی آگئی ؟  
 ڈیوائی ہنسا : اور پھر وہ مستند ہو کر اپنے مکالمے کی طرف متوجہ ہوا۔ نیلا  
 دیوی : آپ کوئی کھانسی نہ کیجئے۔ میں نے بھی دیوی کا ....  
 اشوک اپنے سر کو تھکے مارنے لگا۔ ڈیوائی نے دیکھا تو منتظر ہو کر اس سے  
 پوچھا : کیا بات ہے مشر گنگولی ؟

گنگولی نے ایک زور کا مکا اپنے سر پر مارا : کچھ نہیں۔ سر میں درد تھا۔  
 تو ہو جائے ٹیک ؟

ڈیوائی نے اپنا کدو سا سر ہلایا : ہوا  
 گنگولی نے مردہ آواز میں کہا : کیمرہ ریڈی - ریڈی مشر جگناپ ؟  
 جھونپو سے جگناپ کی منہاٹ سنائی دی - ریڈی !  
 گنگولی نے اور زیادہ مردہ آواز میں کہا -  
 ہٹارٹ ؟

کیمرہ اشارت ہوا - کیپ اشک ہوئی -

سین تھرتی زور - ٹیک ایون !

ڈیوائی نے رانفل ہرائی اور تیرا سے کہنا شروع کیا : خیلا پانی - آپ

کوئی دیری نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا...

اشوک دیوانہ وار چلتا یا؟ کٹ کٹ!

ڈیساٹی نے رائفل فرسٹ پر رکھی۔ اور گھبرا کر اشوک سے پوچھا: اپنی شلیک  
سٹرنگنگولی؟

اشوک نے ڈیساٹی کی طرف قاتلانہ نگاہوں سے دیکھا۔ مگر فوراً ان میں بھڑوں  
کی سی نرمی اور مصروفیت پیدا کرتے ہوئے کہا: کوئی نہیں۔ بہت اچھا  
تھا۔ بہت ہی اچھا۔ پھر وہ عجب سے مخاطب ہوا: آؤ منٹو، ذرا باہر چلیں۔  
سیٹ سے باہر نکل کر اشوک قریب قریب رو گیا۔ منٹو تباہ اب کیا کیا  
مجھ سے یہ وقت ہو گیا ہے۔ پشاور کا پانی اس کے منہ پر چڑھتا ہی نہیں۔ میرا  
خیال ہے پنج کے لئے بریک کر دیں۔

بڑا سمنزل خیال تھا۔ کیونکہ ڈیساٹی سے یہ فوری توقع بالکل فضول تھی کہ وہ  
صبح مکالمہ بول سکے گا۔ ایک دفعہ اگر اس کی زبان پر کوئی چیز جم جائے تو بڑی  
شکل سے ہنسی خفی۔ اصل میں اس کا حافظہ بالکل صفر تھا۔ اسے چھوٹے سے چڑنا  
مکالمہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اگر سیٹ پر وہ پہلی بار کوئی مکالمہ صحت کے ساتھ  
ادا کر جاتا تو اسے محض اتفاق سمجھا جاتا تھا۔ مگر لطف یہ ہے کہ غلط ادائیگی کے  
بار جو ڈیباٹی کو قطعاً اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس نے مکالمے کو  
کس حد تک۔ کس رُلا دینے والی حد تک میخ کیا ہے۔

مکالمے کی ہانگ تو ذکر اس کو مکمل طور پر اپنا بیج کر کے وہ عام طور پر حاضرین کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی ایک دوڑ کھڑا بیٹا تعزیر کا موجب ہوتی تھی مگر جب وہ حد سے تجاوز کر جاتا تو سب کے دل میں یہ غراہش پیدا ہوتی کہ اس کے سر کے کھڑے کھڑے کر دیے جائیں۔

میں فلستان میں تین برس رہا۔ اس دوران میں ڈیساٹی نے چار فلموں میں حصہ لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس کے ایک مرتبہ بھی پہلے ہی مرحلے میں اپنا مکالمہ صحت سے ادا کیا ہو۔ اگر حباب لگایا جائے تو آہنہانی نے اپنی فلمی زندگی میں لاکھوں فٹ فلم ضائع کیا ہوگا۔

اشوک نے مجھے بتایا کہ ڈیساٹی کی دسی ٹیکس کار کا کارڈ پچتر ہے۔ یعنی بجے ٹائمر میں اس نے ایک بار ایک مکالمے کو چوتھ مرتبہ غلط ادا کیا۔ یہ صرف جرمن ٹی ٹوٹر ٹرانزادیشن ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ بہت دیر تک ضبط کیے رہا۔ آخر اس کا چمیانہ بھریہ ہو گیا۔ سرپٹ کر اس نے ڈیساٹی سے کہا: مسٹر ڈیساٹی مصیبت یہ ہے کہ لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ تمہیں پردے پر دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں اور آج میں نے تمہیں ضرور اٹھا کر باہر پھینک دیا ہوں!۔

اور ٹرانزادیشن کی اس صاف گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھری میک ہوٹلے اور اسٹڈیو کے ہر کارکن کو باری باری ڈیساٹی کو دم دلا سادیتے کا فرض ادا کرنا پڑا لیکن کوئی جیل کا درگزر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک بار اکھڑ جائے تو کوئی دوا یا دمس

بشرِ ثابت نہیں ہوتی۔ ایسے وقتوں میں چنانچہ یہی مناسب خیال کیا جاتا تھا کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر دھڑا دھڑالے کیا جائے۔ جب اس کی اور ڈیساٹی کی مرضی بیک وقت شامل حال ہو جائے تو سجدہ شکر ادا کرے۔

اشوک نے پنج کے لئے بریک کر دیا۔ جیسا کہ عام دستور تھا کسی نے ڈیساٹی سے مکالمے کے بارے میں گفت گو نہ کی تا کہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کی یاد تازہ نہ ہو۔ اشوک اور دھڑا دھڑا کی گپیں سناتا رہا۔ ڈیساٹی نے حسب معمول اپنی طرف سے مزاح انگیز باتیں کیں۔ جن میں ذوقِ برابر مزاح نہیں تھا۔ لیکن سب ہنستے رہے۔ پنج ختم ہوا، شوٹنگ پھر شروع ہوئی۔ اشوک نے اس سے پوچھا: کیوں ڈیساٹی صاحب، آپ کو ڈایا لگ یا وہ ہے؟

ڈیساٹی نے بڑے دھڑلے کے ساتھ کہا: ”جی ہوا! لائٹس اون ہوئیں۔ سین تھری فرم ایک نوٹو شروع ہوا۔ ڈیساٹی نے لائٹس لہرا کر دیر سے کہا: ”نیلا دیوی۔۔۔ آپ — آپ — اور ایک دم رک گیا۔“

آئی ایم سوری۔  
اشوک کا دل بیٹھ گیا۔ لیکن اس نے ڈیساٹی کا دل رکھنے کے لئے کہا: ”کوئی بات نہیں — جلدی کیجئے۔“

”سین تھری فرم ایک تھریمن“ شروع ہوا۔ مگر ڈیساٹی نے پشادہ سے چیخا: ”کوئی لگ نہ کیا۔ جب چند اور گمشدیں بھی بار آور نہ ہوئیں، تو میں نے الگ بجاکر



اشوک کو یہ مشورہ دیا "دادا منی" دیکھو یوں کرو۔ جب ڈیساٹی یہ کام ادا کرتا ہے تو وہ کیمبرے کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے اس کا بقایا حقد ادا کرے۔ یعنی پشیاور کا پیشاب پیا ہے، کیمبرے کے سامنے نہ کر کے نہ بولے۔

اشوک سمجھ گیا کیوں کہ اس شکل سے بچنے کی ایک صرف یہی ترکیب تھی کیونکہ ہم بڑی آسانی سے یہ کام بعد میں ڈب کر سکتے تھے۔ اگر وہ سارا کام کیمبرے کے سامنے نہ کر کے ادا کرتا تو اس کے ہنڑوں کی جنبش صحیح مکالمے کے ساتھ چپاں نہ ہو سکتی۔

جب ڈیساٹی کو یہ ترکیب سمجھا لی گئی تو اسے بہت ٹیس پہنچی۔ اس نے ہم سب کو یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کی وہ اب غلطی نہیں کرے گا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اور وہ بھی پشاور کا، اس لئے اس کی منت سماجت بالکل ذہنی گئی، بلکہ اس سے کہہ دیا کہ وہ جو اس کے دل میں آئے بول دے۔

ڈیساٹی بہت بد دل ہوا۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا: "کوئی بات نہیں منٹو میں منہ دوسری طرف مڑوں گا۔ لیکن آپ دیکھیے گا کہ میں ڈاٹا لگ بائیکل کو بیکٹ بولوں گا۔"

سین تھری فور۔ ٹیک نوٹرین کی آواز آئی۔ ڈیساٹی نے بڑے عزم کے ساتھ داخل ہوا میں ہرائی اور ویرا سے مخاطب ہو کر کہا: "نیلا دیوی آپ کوئی ٹکڑہ نہ کیجئے! یہ کہہ کر وہ مڑا۔ میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے۔"

## کشت زعفران

سین کٹ ہوا۔ ڈیساٹی نے فتح مند انداز میں رافضی کندھے پر دکھی اود  
اسوک سے پوچھا: کیوں مشرنگولی؟ اشوک اب باکی سنگ دل بن چکا تھا اس  
نے بڑے دھمکے انداز میں کہا: "ٹیک ہے ٹیک ہے... پھر وہ  
کیمڑہ بن ہر دیپ سے غائب ہوا: پلزنیکٹ شوٹ؟

شوٹنگ ختم ہوئی۔ مجھ اپنے ایک دوست کے ساتھ چرنی گیٹ جانا تھا  
اس نے ہم جلدی جلدی اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی کھڑی تھی ہم ایک ڈبے میں بیٹھ  
گئے کیا دیکھتے ہیں کہ ڈیساٹی صاحب بھی برا جہان میں اود مسافروں کو اپنے کارنامے  
سنا رہے ہیں.... میز دوست جو اس دن کی شوٹنگ دیکھ چکا تھا۔ ڈیساٹی کے پاس  
بیٹھ گیا۔ دودان گفت گرمی اُس نے ایک بڑا بے ڈھب سا سوال کیا۔

"سیٹ پر جو لوگ ڈائلاک بھول جاتے ہیں اُس کو کیا علاج کیا جاتا ہے؟"

ڈیساٹی نے جواب دیا: معلوم نہیں۔ میں تو ایک دفعہ بھی نہیں بھولا۔

اس کا یہ جواب بے حد محسوس تھا۔ جیسے وہ ڈائلاک بھول جانے کے مرض  
سے قطعاً نا آشنا ہے.... میز اخیال ہے کہ خود اُس کو اس کا کامل یقین تھا کہ اُس سے  
کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی اود یہ درست تھا اس لئے کہ غلطی کا احساس تو  
صرف اُسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے اگر صحت کے متعلق کچھ سانسورالان  
کے دماغ میں موجود ہو۔ ڈیساٹی مرحوم کے دماغ میں کوئی ایسا خاتمہ ہی نہیں تھا  
جو غلط ادب میں تیسر کر سکے، وہ اس سے باطل ہے نیز تھا، مصومیت کی حد تک

وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا مزاج کا رشتہ کیا کر رہا ہے وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا کردار کا رشتہ کیا کر رہا ہے، قطعاً نا درست ہے ایسا گناہ آنہائی نے کبھی سرزد نہیں ہوا۔ لوگ اگر اُس کی حرکات پر ہنس ہنس کے دوسرے ہوتے تھے تو اُس کا باعث قدرت کی چھیڑ خانی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اُس کی تخلیق ہی ایسے آب و گل سے کی تھی جس میں زعفران گندھی ہو۔

ایک دفعہ دیس کو درس پر میں نے دوسرے اُس کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بیوی سے کہا: وہ ڈیسا ٹی ہے.... وہ آ میری بیوی کے اُس جانب دیکھا اور بے اختیار ہنستا شروع کر دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا: اتنی دُور سے دیکھنے پر اس قدر بے تحاشا ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟

وہ میرے سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکی۔ صرف یہ کہہ کر وہ اور زیادہ ہنسنے لگی؟ معلوم نہیں!

آنہجہائی کو دیس کا بہت شوق تھا۔ اپنی بیوی اور لڑکی کو ساتھ لانا تھا مگر دس روپے سے زیادہ کبھی نہیں کھیلتا تھا۔ اُس کے بیان کے مطابق کئی جگہ اُس کے بہت ہی قریبی دوست تھے جو اس کو سولہ آنے کھری ٹپ دیتے تھے یہ ٹپ وہ اکثر دوسروں کو دیتا تھا۔ اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اسے اپنے تک رکھیں اور کسی اور کو نہ بتائیں خود وہ کسی اور کی دی ہوئی ٹپ پر کھیلتا تھا۔

دیس کر میں پر جب میں نے اُس کو اپنی بیوی سے شرافت کرایا تو اس نے ایک شہور یعنی یقینی شپ دی۔ جب وہ ڈاکٹر تو اُس نے میری بیوی سے پُر تعجب ہجے میں کہا: حد ہو گئی ہے..... یہ شپ تو آتا ہے مانگتی تھی؟ اُس نے خود ایک دوسرے نمبر کا گھوڑا کیلا تھا جو چلیں آگیا تھا۔ اس پر اُس نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ڈیساٹی انجینیائی کی ادائیگی زندگی کے متعلق لوگوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ خود میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ گجرات کے ایک متوسط گھرانے کا نسب تھا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اُس نے این این بی کیا۔ چھ سات برس تک بجے کی چھوٹی عدالتوں کی خاک چھانتا رہا۔ اُس کی پرنکیش سولہ تھی لیکن اس کا گھربار چلانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب وہ دماغی عارضے میں گرفتار ہوا۔ تو اُس کی مالی حالت بہت پست پست ہو گئی ایک عرصے تک نیم پاگل رہا۔ علاج معالجے سے یہ عارضہ دور تو ہو گیا مگر ڈاکٹروں نے دماغی کام کرنے سے منع کر دیا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ مریض پھر عود کر آئے..... اب ڈیساٹی غریب تھے بڑی شکل تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ وکالت ظاہر ہے کہ یکسر دماغی کام تھا۔ اس لئے ادھر رجوع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کچھ عرصے تک وہ ادھر ادھر ڈاکٹر ہاؤس ہاؤس بدلتا رہا۔ تہذات سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی حالانکہ اُس کی رگوں میں نشیت گجراتی خون تھا۔

جب حالات بہت نازک ہو گئے تو وہ ساگر مووی ٹون کے مین ڈیپٹیائی سے براہِ خواہش ٹاکر کی کر آئے اسٹوڈیو میں کام بن جائے۔ اصل میں اُس کا مقصد یہ تھا کہ اُسے ایکٹنگ کا موقع دیا جائے۔ مین لال جبرانی اور ڈیپٹیائی تھا اُس نے وی ایچ کو ملازم رکھ لیا اُس کے کہنے پر چند ڈائریکٹروں نے آزمائش کے طور پر مختلف فلموں میں تھوڑا تھوڑا کام دیا۔ اس سنجے پر پینچے کہ اُس کو پھر آزمانا بہت بڑی غلطی ہے۔ چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے بیکار ساگر مووی ٹون میں پڑا رہیں توڑ مار ڈالے۔

اس دوران میں مسٹر مہاسورائے بچے ٹائیکز قائم کر چکے تھے جس کے متعدد فلم کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ اس ادارے کے متعلق شبہ نہ تھا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر کرتا ہے یہ درست بھی تھا۔ چنانچہ ڈیپٹیائی قسمت آزمائی کے لئے وٹاں پہنچا۔ دو تین چکر لگانے اور مختلف سفارشی خطوط حاصل کرنے کے بعد مسٹر مہاسورائے سے ملا۔۔۔۔۔ مہاسورائے نے اس کی شکل و صورت اور اس کی تمام کمزوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک خاص کردار وضع کیا اور ہندوستانی لاسکرین کو ایک ایسا ایکٹر بخشا جو ایکٹنگ سے باہل نا آشنا تھا۔

پہلے ہی فلم میں وی ایچ ڈیپٹیائی فلم بینوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بچے ٹائیکز کے عملے کو شوٹنگ کے دوران میں جو مشکلات پیش آئیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ سب کی قوت برداشت جواب دے جاتی تھی۔ مگر وہ اپنے تجربے

میں ڈٹے رہے آخر کامیاب رہے اس غم کے بعد ڈیسا ئی بیٹے ٹائیز کے غلوں کا  
 جزو لاینفک بن گیا اُس کے بغیر بیٹے ٹائیز کی غلم غیر مکمل اور دو کھلی سکیں جاتی تھیں۔  
 ڈیسا ئی اپنی کامیابی پر خوش تھا مگر اُس کو حیرت ہرگز نہیں تھی وہ سمجھتا تھا کہ  
 اُس کی کامیابی اُس کی ذکاوت و ذکاوت اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے مگر  
 خدا بہتر جانتا ہے کہ ان تمام چیزوں کا اُس کی شہرت اور کامیابی میں ذرہ برابر دخل  
 نہیں تھا۔ یہ صرف قدرت کی قسم طریق تھی کہ وہ غلوں کا سب سے بڑا غراب بن گیا تھا۔  
 پوری موجودگی میں اُس نے فلستان کے تین غلوں میں حصہ لیا ان تین غلوں کا  
 نام علی الترتیب یہ ہے ”چل چل“ ”رہے نرجوان“ ”شکاری“ اور ”آٹھ دن“ ہر غلم کی  
 عیادی کے دوران میں ہم اُس کی طرف سے متعدد بار مایوس ہوئے مگر شکر اور  
 کرجی چونکر مجھے بتا چکے تھے کہ اُس سے کام لینے کے لئے پتا قطن طہ پر مار دینا  
 پڑتا ہے اس لئے مجھے اپنی جلد گھبرا جانے والی طبیعت کو قابو میں رکھنا پڑا اور  
 بہت محنت تھا کہ میں ”چل چل“ رہے نرجوان“ کی شرمگ ہی کے دوران میں ٹوہرے  
 جہان کو چل پڑتا۔ ویسے کبھی کبھی غصے کے عالم میں یہ خواہش جڑی قدرت سے پیدا  
 ہوتی تھی کہ کیمرو آشاکر اُس کے سر پر دے مارا جائے۔ مگر دونوں کا پورا بوم اس  
 کے حلق میں کھونس دیا جائے اور سارے بلب اتار کر اُس کی لاش پر ڈھیر  
 کر دیتے جائیں مگر جب اس قصد سے اُس کی طرف دیکھتے تو یہ سنا کا نہ عزم  
 ہنسی میں تبدیل ہو جاتا۔

مجھے معلوم نہیں عزرائیل علیہ السلام نے اُس کی جان کیوں کر لی ہوگی کیونکہ اُس کو دیکھتے ہی ہنسی کے مارے اُن کے پیٹ میں ہل چڑھتے ہوئے گئے۔ مگر سنا ہے کہ فرشتوں کے پیٹ میں ہوتا۔ کچھ بھی ہو ڈیسا کی جان بچتے ہوئے وہ یقیناً ایک بہت ہی دلچسپ تجربے سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

جان لینے کا ذکر آیا تو مجھے ”شکاری کا آغزی سین یاد آگیا“ اس میں ہمیں ڈیسا کی جان لینا تھا۔ انہیں بے رحم جاپانیوں کے ٹانگوں زخمی ہو کر مرنا تھا۔ اور مرتے وقت اپنے ہونہار اور بہادر شاگرد بدول را شوک کا دھمکی محسوس دیکر اسے مخاطب ہو کر یہ کہنا تھا کہ وہ اس کی موت پر مغموں نہ ہوں، اور اپنا نیک کام کئے جائیں مکالموں کی صحت ادانگی کا سوال حب معمول تھا مگر اب یہ مصیبت درپیش تھی کہ ڈیسا کی کو کس انداز سے مارا جائے کہ لوگ نہ ہنسیں میں نہ تو اپنا فیصلہ دے دیا تھا کہ اس کو اگر سچ مح بھی مل دیا جائے تو لوگ ہنسیں گے وہ کہیں یقین ہی نہیں کریں گے کہ ڈیسا کی مر رہا ہے یا سر چکا ہے۔ اُن کے ذہن میں ڈیسا کی کی موت کا تصور ہی نہیں سکتا۔

میرے اختیار میں ہوتا تو میں نے یقیناً یہ آخر کا سین حذف کر دیا ہوتا۔ مگر شکل یہ تھی کہ کیانی کا بہاؤ ہی کچھ ایسا تھا کہ انہما میں اُس کی کیتھ کی موت ضروری تھی جو کہ اُسے سونپا گیا تھا، کئی دن ہم سوچتے رہے کہ اس شکل کا کئی حل مل جائے مگر ناکام رہے۔ اب اسکے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اُسے مرنا دکھایا جائے۔

مکالموں کی صحت اس ثانوی اہمیت رکھتی تھی، جب دیر سلیں کی گیتیں تو ہم سب نے نوٹ کیا کہ وہ نہایت ہی مضحکہ خیز طریقے پر کرتا ہے، اشوک اور دیر سے صاحب ہوتے ہوئے یہ کچھ اس انداز سے اپنے دونوں ہاتھ داتا ہے۔ جیسے کوک بڑا کھلوتا اُس کی یہ حرکت بہت ہی خندہ خیز تھی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ ساکت پڑا رہے اور اپنے بازوؤں کی جنبش بند کر دے۔ مگر دماغ کی طرح اُس کا جسم بھی اُس کے اختیار سے باہر تھا۔

بڑی دیر کے بعد آخر اشوک کو ایک ترکیب سوجھی اور وہ یہ تھی کہ جب یہ شروع ہو تو دیر اور وہ دونوں اُس کے ہاتھ پکڑیں یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جب یہ دے پر یہ فلم پیش ہوئی اور ڈیساں کی سرت کا یہ منظر آیا تو سارا حال تبدیل ہو گیا۔ گویا آتش... ہم نے فوراً دوسرے شو کے لئے اُس کو قہقہے سے متحرک کر دیا۔ مگر تماشائیوں کے دماغ میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ آخر تھک چکا اُس کو لیجے کا ویسا بچنے دیا۔

ڈیساں کی انجمنی بے حد کمبوس تھا کسی دوست پر ایک دھڑی بھی فروغ نہیں کرتا تھا بڑے عرصے کے بعد اُس نے قسطوں پر اشوک سے اُس کی پرانی موٹر خریدی وہ خود چونکہ ڈرائیور کرنا نہیں جانتا تھا اس لئے ایک ملازم رکھنا پڑا مگر یہ ملازم ہر دسویں پندرہویں روز بدل جاتا تھا۔ میں نے ایک روز اُس کی وجہ دریافت کی تو ڈیساں ہلکے کر گیا۔ لیکن مجھے ساؤنڈ ریکارڈسٹ جگتا پ نے بتایا کہ



ڈیساٹی صاحب ایک قاضی اور کچھتے ہیں نور نے کے طبع پر اُس کا کام دس بارہ روز دیگتھے ہیں اور پھر اُسے "کنڈم" کر کے دوسرا کر لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ مگر اسی دوران میں اُس نے خود موثر چلانا سیکھ لیا۔

آنجناب کی دسے کی شکایت بہت عرصے سے تھی یہ مرض لاعلاج قرار دے دیا گیا تھا کہ جس کے کہتے پر اُس نے ہر روز دووا کے طبع پر تھوڑی سی خشک سہلگ کھا تا شروع کی تھی اب وہ اس کا عادی بن گیا تھا شام کو سرویس کے موسم میں برانڈی کا آدھا پیگک بھی پیتا تھا اور خوب چمکا کرتا تھا۔

"آنجناب" میں ایک سین ایسا تھا کہ اُسے پانی کے تپ میں بیٹنا تھا موسم خوش گوار تھا مگر اُس کی حد سے نازک طبیعت کے لئے ناقابل برداشت حد تک سرد تھا۔ ہم نے اس کے پیش نظر پانی گرم کر دیا۔ اور ساتھ ہی پوڈوگٹن مینبرے کبہ دیا کہ برانڈی تیار رکھے جن اصحاب کے یہ نظم دیکھی ہے۔ اُن کو یہ منتظر مزود یاد ہوگا جس میں ٹیکم لارڈ ڈیساٹی (سر نریندر کے فلیٹ کے غسل خانے میں شب میں بیٹھا ہے سر پر برف کی تھیلی ہے) ایک چھوٹا پنکھا چل رہا ہے۔ اور وہ شراب کے نٹے میں راحت یہ کہہ رہا ہے: "چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ اور پر برف کا پہاڑ ہے..... وغیرہ وغیرہ۔"

شوٹنگ ختم ہوئی تو جلدی جلدی ڈیساٹی کے کپڑے تبدیل کرائے گئے اور اُس کے بدن کو اسی طرح خشک کیا گیا۔ پھر اُس کو ایک پیگ برانڈی کا دیا گیا

یہ اس کے صلت سے نیچے آری تو اس نے جیکن شروع کر دیا۔ اتنی تھیل مقدار  
ہی نے اسے پورا شرابی بنا دیا، کمرے میں صرف میں موجود تھا۔ چنانچہ وہ بے کفایت  
جھڑے لہجے میں اپنے تمام کاموں کی داستان سنانے لگا۔ کچہریوں میں وہ  
کیسے مقدمے لڑتا تھا اور کس شاندار اور زوردار طریقے پر اپنے مڑکوں  
کی وکالت کرتا تھا۔

ڈیپٹی قائدِ منظم محمد علی جناح مرحوم اور شری بھولا جانی ڈیپٹی کی قانون  
مانی اور ان کے زور و کثرت کا بہت معترف تھا۔ قائدِ منظم مرحوم سے وہ کئی بار  
حرفِ ملاقات حاصل کر چکا تھا اور متعدد مرتبہ عدالتِ عالیہ میں ان کی قانونی  
مشکلیاں سن چکا تھا۔

غالباً انھوں نے قلم اٹھانے ہی کا زمانہ تھا کہ حکومتِ پنجاب نے زیر دفعہ ۱۴۶  
میرے وارنٹ جاری کئے میرے افسانے بوز پر فحاشی کا الزام تھا۔ اس کا ذکر ڈیپٹی  
سے ہوا تو اس نے اپنی قانونی واقعیت بگھارنا شروع کر دی۔ دعتاً  
مجھے ایک دلچسپ شرارت سوجھیں، وہ یہ کہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے  
اسے منتخب کروں۔ عدالت میں یقیناً ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا جب وہ میری  
طرف سے پیش ہوتا۔ میں نے اس کا ذکر کمرے سے کیا وہ فوراً مان گئے بات  
واقعہ مزے کی تھی۔

گھما جوں کی فہرست بنائی تو میں نے انڈین چارلی نو محمد کو بھی اس میں شامل کیا۔

چار ماہ اور ڈیڑھ ماہ سا سہ ماہیہ کہ عدالت کے کمرے میں کھینچنے کے لئے کافی تھے، میں اس کا تصور کرتا تو میرے سامنے وہ دہلی ہنس کا چتر پھرتے گھٹا، جگڑا نوس کو شرتنگ کی مشکلات کے با صفت میرا یہ دلچسپ خواب پڑا نہ ہوا۔

ڈیوانی نے متعلقہ دفعہ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں جو میرے نزدیک تعلق ضروری نہیں تھیں اس لئے کہ میں تو صرف تفریح چاہتا تھا۔ تو دھند چار ماہ میں اپنی گواہی کا خاکہ تیار کر لیا تھا مگر وہ ادھر نہ سمیت میں کچھ اس طرح اپنے غلوں کی شوثنگ میں مصروف تھا کہ ایک دن کے لئے بھی بجے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

ڈیوانی کو انوس تھا کہ آسے اپنی قانونی قابلیت دکھانے کا موقع ملا کہ سمیت کی نگاہوں سے یہ بالکل اوجھل تھا کہ آس کی اس قابلیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ جب وہ عدالت میں پیش ہو تو بار بار برکھلانے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے بار بار بھولے۔ پشاور کے پانی کو پیشاب بنائے اور اتنے ہی ٹیک کرانے کہ سب کی طبیعت صاف ہو جائے۔

ڈیوانی مڑھکا ہے ورنہ گی میں صرف ایک بار آس نے ہی ٹیک ہونے نہیں دیا۔ دیہرسل کٹے بغیر آس نے عزرائیل علیہ السلام کے حکم کی تعمیل کی اور لوگوں کو مزید ہنسائے بغیر موت کی گود میں چلا گیا۔

## بابوراؤ پٹیل

عالمِ سنِ اذیتیں کی بات ہے کہ بابوراؤ کے میری ملاقات ہوئی، میں ان دنوں سہستہ دارۃ مصورۃ ایڈٹ کیا کرتا تھا، تنخواہ واجبی تھی، یعنی کل چالیس روپے ماہوارۃ مصورۃ کا مالک نذیر لودھیانوی چاہتا تھا کہ میری اس آمدنی میں کچھ اضافہ ہو جائے، چنانچہ اس نے میرا تعارف بابوراؤ پٹیل، ایڈیٹر فلم انڈیا سے کرایا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی اس ملاقات کا حال بیان کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ فلم انڈیا معروضی وجود میں کیسے آیا، آپ کو یاد ہوگا ایک زمانہ تھا جب ہونڈکی پر جات فلم کہنی اپنے پردے عروج پر تھی، "امریت ملتنن" اور "امر جیوتی" جیسے امر فلم پیش کر کے اس نے ہندوستان کے اکثاف و اطراف میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی، اب وہ ایک معمولی امدادہ نہیں رہا تھا بلکہ پر جات ٹکڑا

میں تبدیل ہو چکا تھا جس کا ہر دکن عزم و اجتہاد کے نشے میں غمور تھا شائستہ نام  
سید نقیہ لال، دھامبر..... سب کو ایک ہی گن تھی کہ ان کی کہن فن اور تکنیک میں  
سب کو پیچے چھوڑ جائے۔

اسی زمانے میں جب کہ پربھات، وسعت اختیار کر رہی تھی اور حاضر خدمت کی  
طرح خوبصورت اور باوقار تھی اس نے اپنے بلن سے تین بچے پیدا کئے۔

۱۔ فیس یکپوز، جو پربھات کے فلموں کا واحد تقسیم کار ادارہ مقرر ہوا اس کے  
مالک بابو راؤ پائی تھے۔

۲۔ بی۔ بی۔ سمانت اینڈ کمپنی۔ اشتہادوں کے تقسیم کار۔ پربھات کے تمام فلموں  
کی نشر و اشاعت کا کام اس ادارے کے سپرد ہوا۔

۳۔ نیوجیک پرنٹنگ پریس..... گننام سا پریس تھا اس کے مالک یاد کر تھے  
ان کو پربھات نے اپنے تمام پوسٹروں، دستی اشتہادوں اور سٹائپوں کی جیپان  
کا کام تفویض کر دیا۔

نعمت آبادی نیوجیک پرنٹنگ ورکس سے پیدا ہوا۔ یاد کر بابو راؤ کا دوست تھا۔  
معمولی سا بڑھا کھٹا آدمی، ان دونوں نے مل کر چلان بنایا، پریس موجود تھا، کاغذ  
دستیاب ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان دنوں بہت سستا تھا، بی، بی، سمانت  
کمپنی موجود تھی، اس سے پربھات فلم کمپنی کے علاوہ دوسری فلم کمپنیوں کے  
اشتہاد بھی لکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ سب لوازم موجود تھے..... اور بابو راؤ

بڑا صنعت آدمی ہے اور وقت پر دس میں اس کے علاوہ وہ خواب دیکھنے والا آدمی نہیں مگر یہی محاورے کے مطابق وہ کیل کے سر پر چوٹ لگا تا جانتا ہے چنانچہ جب "قلم انڈیا کا پہلا پرچہ شائع ہوا تو یہ واقعہ ہے ہندوستان میں نئی صہانت کا ایک نیا دور کھلنا اور شروع ہوا۔

بابوراؤ کے قلم میں نصاحت تھی، بلاغت تھی، نگینوں کی سی جگہاں بھی تھی اس کے علاوہ اس میں ایک ناقابلِ نقل طنز اور مزاح تھا ایک زہر تھا جو میں سمجھتا ہوں یہاں ہندوستان میں کسی انگریزی لکھنے والے ادیب کے قلم کو نصیب نہیں ہوا۔ بابوراؤ کے قلم کی جس تھلنے نے اس کی دھماک جمانی وہ اس کا ترکیبیت ہی ترکیب طنز تھا جس میں بکا سا گند پٹا بھی شامل تھا۔ اس صنف سے ہندوستانی لکھنے والے نا آشنا تھے اس لئے اس کی تحریریں لوگوں کے لئے چاٹ کا مزہ دینے لگیں۔

بابوراؤ بڑے شخصے کا آدمی ہے اس نے اپنا دفتر اپلا سٹریٹ کی مبارک بلڈنگ کے ایک وسیع و عریض فلیٹ میں قائم کیا اور اُسے ہر ممکن طریقے سے پارےب بنایا۔

مبارک بلڈنگ کے اسی وسیع و عریض دفتر میں بابوراؤ سے میری پہلی ملاقات ہوئی، اس وقت تک "قلم انڈیا" کے غالباً سات آٹھ شمارے نکل چکے تھے۔ جو میں مصدقہ دفتر میں دیکھ چکا تھا اور تاثر ہو گئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

میرا خیال تھا ایسی تسخیری انگریزی کہنے والا اور نو کیلے طرز کا مالک، ڈبلا پتلا اور  
تینکے تینکے نقشوں والا آدمی ہوگا، مگر جب میں نے ایک باٹ کو ایک جہادزی میز  
کے پاس گھومنے والی کرسی پر بیٹھے دیکھا تو مجھے سنت ناما میدی ہوئی، اس کے  
چہرے کا کوئی نقش، کوئی خط ایسا نہیں تھا، جس میں اس کے قلم کا ہلکا سا عکس  
بھی نظر آئے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چوڑا ہلکا چہرہ، موتی ناک بڑا ادھیات لب  
وہان، دانت بد نما..... لیکن پشیمانی بڑی۔

جب وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے آٹھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے اونچا  
ہے۔ یعنی کافی دراز قد ہے۔ مضبوط ذیل ڈول، لیکن جب اُس نے ہاتھ ملا یا تو گرفت  
بڑی تحصیل اور جب اس نے اردو میں بات چیت شروع کی تو میرا سلا مزہ گرا  
ہو گیا۔ گفتگو اداں کا سالب و لہجہ بات بات میں بمبئی کے سوائیوں کی طرح "سلا" کہنا  
تھا اور ادگالیاں بکتا تھا۔

میں نے خیال کیا، شاید اس لئے کہ اس کو اردو نہیں آتی، لیکن جب اُس نے  
ٹیلی فون پر کسی سے انگریزی میں گفتگو شروع کی تو خدا کی قسم میرے دل میں شک  
پیدا ہوا کہ یہ شخص سہ گز سہ گز وہ بابو راجو پائیس نہیں جو ظلم انڈیا کا اور یہ کہتا ہے  
"بچے کا رنگ" رقص کرتا ہے اور سوالوں کے جواب دیتا ہے، معاذ اللہ کیا اب دلجو  
تھا، ایسا لگتا تھا کہ انگریزی سہ سہی میں اور مرہٹی، بمبئی کی گوند بول میں بول رہا ہے۔  
یہاں بھی ہر فعل شاپ کے لہجہ یا اس سے پہلے ایک "سلا" ضرور آتا تھا۔

میں نے دل میں کہا: اگر میں سالہا بابر راؤ پاٹیل ہے تو سالہا میں سہولت جن نشو

نہیں ہوں؟

تھوڑی دیر گشت گزری، اندر لدھیالوی نے میری بہت تعریف کی اس پر  
بابر راؤ نے کہا: مجھے بالوم ہے۔ وہ سالہا عابد گل ریڑھ پر بٹختے مجھ کو مستعد ہر صبح کے  
ستنا جاتا ہے۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: یہ سالہا نشو کیا ہوا؟  
میں نے اس کو اس کا مطلب بتا دیا۔

مسٹر مرٹ استنا تھا کہ پر بھات کے کسی فلم کی "چرچہ" یعنی کتابچے میں  
جو کہانی کا خلاصہ تھا اور مجھے بابر راؤ نے لکھا تھا۔ مجھے اس کا اردو میں ترجمہ  
کرنا تھا۔ میں نے یہ خلاصہ لے لیا اور ترجمہ کر کے اندر لدھیالوی کے ہاتھ آئے بھجوا  
دیا۔ جو اس نے بہت پسند کیا۔

اس کے بعد دیر تک میری اس کی ملاقات نہ ہوئی، میں دفتر سے بہت کچھ ہر  
نکلتا تھا۔ فلم کمپنیوں میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے در بدر مارے پھرتا، یہ  
اس وقت بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔

بابر راؤ نے کسی نہ طرح شانتا رام کو آگیا کہ وہ "پر بھات" کا ایک ٹائٹل  
پرچہ شائع کرے، جس میں وہ بالکل نئے انداز سے ان کی فلم کمپنی کی افغان کے  
نکلوں کی پیشکش کرے گا۔ شانتا رام گوان پڑھ گیا تھا۔ مگر آرتھ تھا اور بہت  
اعطی پائے کا۔ طبیعت میں آپکی تھی فوراً مان گیا، بس پھر کیا دیر تھی "پر بھات"



نکل آیا اور جڑی شان سے، بابوراؤ نے واقعی بڑے انوکھے انداز سے انداز میں  
پر بات دالیں اور ان کے فلموں کی پیشگی۔

نذیر لدھیانوی بڑا وقت شناس اور مطلب کھانے والا آدمی تھا۔ فوراً  
بابوراؤ کے پاس پہنچا۔ یہ اسکیم بے کر کو پر بات کے ہر شک کے کچھ تھے معصوم  
میں بھی شائع ہونے چاہئیں۔

میں میدان ایک بات عرض کر دوں کہ بابوراؤ نے چونکہ مغربی کے دن دیکھے  
میں، اس لئے وہ حاجت مندوں پر ہمیشہ مہربان ہو جاتا ہے اس کو معلوم تھا کہ نذیر  
کی مالی حالت کوئی زیادہ اچھی نہیں، اس لئے وہ فوراً اس کی تجویز مان گیا۔ لیکن اس کو  
شبہ تھا کہ جو کچھ اس نے انگریزی میں لکھا ہے۔ اردو میں منتقل نہ کر سکے گا۔ نذیر نے  
میرا نام لیا تو وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا۔

ایمان کی بات ہے میرا انگریزی کا علم بہت محدود ہے۔ بابوراؤ نے جو کچھ  
لکھا تھا وہ میری سمجھ سے بالا تر تو نہ تھا۔ مگر اس کا اردو میں من و عن ترجمہ  
کرنا بہت ہی دشوار تھا اس کا ایک خاص طرز تھا الفاظ کی نشست و برخاست  
ایک خاص قصب کی تھی، انگریزی اور امریکی دونوں محاورے تھے لیکن الفاظ  
پر وہ کبھی کبھی لکھا تھا اب میں کیا کرتا۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہی بات سمجھ میں  
آئی کہ مضمون سامنے رکھوں اور اس کے مفہوم کو اپنے انداز اور اپنی زبان میں  
منتقل کر دوں، چنانچہ میں نے یہی کیا۔

جب یہ خرافات چھپ گئی تو فزیرا پرچے لے کر اس کے پاس گیا۔  
 میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا: سالانہ تقریبی بابورائڈ  
 بننے کی کوشش کرتا ہے؟

میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کو ساری بات سمجھا دی کہ تہااری تحریر  
 کو اردو میں لانے کی صرف ایک یہی صورت تھی — میں سمجھتا ہوں میں نے  
 جو کیا جائز ہے؟

دائیں ہاتھ کی آخری انگلیوں میں سگرٹ دبائے ٹیٹ دیہیتوں اور  
 موایوں کی طرح اس نے مٹھی بند کر کے زود کاکش کیا اور کہنے لگا: سالانہ تقریب  
 عابد گل ریز سے سب سے زیادہ بہت مزا آئی — میں نے اس کو کہہ دیا (گالی)۔  
 تو کہتا تھا کہ اردو کا بہت بڑا رائٹر ہے؟

میں اس داد سے بہت خوش ہوا، مگر نہ چھوٹے ہو گیا کہ آئندہ نہ بچے کا یہ سلسلہ  
 اسی طرح جاری رہے گا — مگر وہ ہی پرچوں کے بعد بند ہو گیا، کیونکہ پرچہ بارت  
 فلم کمپنی اتنے زائد شائد خرچ کی کھیل نہیں ہو سکتی تھی۔

میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کہ وہ مجھے کچھ نہ کر اور موضوعات کی  
 طرف لے جائیں گی۔ جو اس داستان کے ریشوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں، مجھے اصل  
 میں بابورائڈ پائیل کے عشق اپنے تاثرات بیان کرتا ہیں۔

چند ایسے واقعات ہوئے کہ تذکرہ سے میرے ..... زندہ .... (ابھی

نہیں رہ بعد کی بات ہے، جی ہاں۔ میں نے شادی کا ارادہ کر لیا۔ ان دنوں ہی اسپرٹی فلم کھنی میں اسی روپے ماہوار پر نوکر ہوا تھا۔ یہاں ایک برس ملازمت کی۔ مگر تنخواہ صرف آٹھ مہینے کی تھی۔ چار مہینے کی باقی تھی۔ کہ اس کپنی کا دیوالہ پٹ گیا۔

یہاں سے میں سرورج فلم کپنی میں چلا گیا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ کپنی نے بند ہونے کا ارادہ کر لیا تھا، مجھے یقین ہوئے والا تھا کہ میں ہنر قدم ہوں کہ اس کپنی کے بند ہونے کے غم کو اسے ہی عرصے بعد اس کے سیٹھ نے نقد پاؤں مار کر ساسی چار دیواری میں ایک نئی کپنی کھڑی کر دی، یہاں میں سو روپے ماہوار پر ملازم ہوا۔ ایک کہانی تھی۔ یہ تین چوتھا فیضان بھی گئی۔ اس دوران میں میرا نکاح ہو چکا تھا۔ اب صرف رخصتی باقی تھی۔ جس کے لئے مجھے پڑے کی ضرورت تھی۔ تاکہ کوئی معمولی سا علیٹ کرائے پر لے کر اسے گھر میں تبدیل کر سکوں۔ جب روپیہ مانگنے کا وقت آیا تو ٹیٹھانا بھائی نے صاف جواب دے دیا۔ اور کہا میری حالت سخت خراب ہے، اس کی حالت تو جو خراب تھی سوتھی، لیکن یہ غور فرمائیے میری حالت کتنی خراب ہو گئی، میں نے سیٹھ کو سارے واقعات سے آگاہ کیا۔ مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رہی، معاملہ بڑھ گیا۔ تو ٹیٹھان میں غم شروع ہوئی تو اس نے مجھے کپنی سے نکال باہر کیا۔ میری عزت پر یہ صاف حملہ تھا، میرا وقار بالکل مٹی میں مل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے تہتہ کر لیا کہ وہیں باہر

سندھ دھانڑے پر بیٹھ کر بھوک بھڑتاں شروع کر دیں گا۔

اس معاملے کی خبر کسی دکانی طریقے سے بابو راؤ تک پہنچ گئی۔ اس نے پہلے تو نانو بھائی ڈیپانی کو فون پر بہت گامیاں دیں۔ جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا، تو سیدھا اسٹریو پنچا اور بارہ سو روپے کا فیصلہ آٹھ سو روپے میں کرادیا۔ میں نے کہا چلو بھائی چور کی سنگوٹی ہی سہی۔

میرا گھر بس گیا۔

ہاں میں آپ سے یہ کہنا بھول گیا، جس زمانے میں اسپرلی فلم کمپنی میں تھا۔ ان دنوں وہاں ایک بہت ہی شریف الطبع ایجنٹس پیدا دیوس کے نام سے تھی۔ میرے پہلے فلم گسان کنیا درنگین، اکی بیرون ہی تھی۔ میرے اس کے بڑے دوست تعلقات تھے، لیکن اس کا صبح یعنی جہانی تعلق بابو راؤ پائیل سے تھا جو اس پر بڑی کڑی نگرانی رکھتا تھا۔

یہاں آپ کو یہ بتادینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بابو راؤ پائیل کی موت دو بیڑیاں تھیں، ان میں سے ایک کریم نے دیکھا ہے، جو ڈاکٹر تھی۔

خیر چند ایسے واقعات ہوئے کہ خبر نے میری سب سے لٹ خدمت اور دوستی شکرا دی۔ ہم دونوں الگ ہو گئے، اس کا مجھے افسوس تھا، میں اس سے تیسرا ہی کیا تھا، لیکن پھر بھی وہ میرے مکان کا کرایہ جو پچیس روپے بنتا تھا، ادا کر دیا کرتا تھا۔ ان دنوں میں نے بیڈیو میں بھی کتنا شروع کر دیا تھا۔ بس کن اب

چونکہ میری ایکلی جان کا سوال نہیں تھا، اس لئے میں نے سرچاکہ بابو راؤ سے  
منا چاہئے۔۔۔ لیکن ٹھہریئے۔۔۔ میں آگے چلا آیا۔ وہ میان میں بے آپ سے  
کچھ اور بھی کہنا تھا۔

میری شادی عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی، کچھ ایسے قصے تھے کہ  
میرے گھر میں سوائے میری والدہ کے اور کوئی نہیں تھا، مسلم اند سٹری کے  
تمام آدمی آرہے تھے۔ ان کی خاطر دہائی کون کرنا، ایک خفیہ عورت بچاؤ کی کار  
سکتی تھی۔

بابو راؤ کو کہیں سے معلوم ہوا کہ منٹو پریشان ہے تو اس نے اپنی چستی بگلیں  
لکھ پدا دیں کر بھیج دیا کہ جاؤ، اس کی والدہ کا ہاتھ بٹاؤ، مجھے اچھی طرح یاد ہے،  
پہلے میری بیوی کو شاید کوئی زبردستی بھی دیا تھا۔

چلیئے باب چلتے ہیں۔۔۔ جی ہاں میں بابو راؤ کے پاس پہنچا، اس لیے کہ  
وہ اردو کا ایک بہتہ دار اخبار کارواں بھی نکالتا تھا، صرف اس غرض سے کہ عابد گل نے  
کے لئے جو اس کا دوست تھا، روزی کا ایک دوسید بن جائے۔ مگر وہ ایک  
لاٹوالی طبیعت کا شاعر آدمی تھا۔ اور ان دنوں اخبار سے علیحدہ ہو کر مکالمہ نویس  
گیت نگاری اور فلم سازی کے چکر میں پڑا تھا۔

میں نے بابو راؤ کو برطرفی کا رہ نموش دکھایا۔ جو مجھے تذیرو نے بھیجا تھا اسے  
دیکھ کر بابو راؤ نے غصہ کے لئے چکرا گیا۔ بہت بڑی گالی دے کر اس نے

صرف اتنا کہا : ایسا ؟

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا ۔

بابو راؤ نے فوراً ہی کہا : تو سالانہ ادھر کیوں نہیں آ جاتا — اپنا کھڑا ہے — سالے کو پوچھنے والا ہی کوئی نہیں ؟

میں نے جواب دیا : اگر ایسی بات ہے تو میں تیار ہوں ؟

بابو راؤ نے نور سے آواز دیا : ریشا !

دروازہ کھلا ۔ ایک مشہور پنڈتیوں اور سخت چھاتیوں والی گہرے سانولے رنگ کی گرسچمین لڑکی اندر داخل ہوئی ۔

بابو راؤ نے اسے آنکھ ماری : ادھر آؤ !

وہ اس کی کرسی کے پاس چلی گئی ۔

بابو راؤ نے کہا : منہ ادھر کر دو !

اس نے حکم کی تعمیل کی ۔

بابو راؤ نے ایک ایسا دھپا اس کے چہ نظروں پر مارا کہ اس کے کولہوں کا سلا گوشت جل گیا : جاؤ کہ غنڈھیل لاؤ ! لڑکی جس کا نام ریشا کارا لائی تھا اور جو بابو راؤ کی بیک وقت بیکر خری ، شینو اور واسنتہ تھی چلی گئی اور فوراً ہی مشرٹ منیڈ کی کاپی اور منسل لے آئی ۔ بابو راؤ میرے نام کا اپائنٹ منٹ میٹر لکھوانے لگے بتخوہ کے پاس پہنچا تو رک گیا اور منجھ سے مخاطب ہوا : کیوں منٹو کتنا چلے گا ؟

پھر فرزدی کہا: ایک سو تیس چھٹیک ہے ۱

میں نے کہا: "نہیں؟"

بابوراؤ سنجیدہ ہو گیا: دیکھو نمبر — یہ سالہ کاروں زیادہ انورہ نہیں کر سکتا؟

میں نے کہا: تم میرا مطلب غلط سمجھ رہے ہو — میں ساٹھ روپے بابوراؤ پر کام کروں گا۔ اس سے کم نہ اس سے زیادہ؟

بابوراؤ سمجھا، میں اس سے مذاق کر رہا ہوں، پر جب میں نے اسے یقین دلایا کہ میرا یہ کوئی مطلب نہیں تو وہ اپنے مخصوص گنوار بچے میں برلا، ۱۰ سالہ میڈ ملتا۔

میں نے اس سے کہا: میں میڈ ملتا یعنی پاگل ملتا ہی کبھی۔ لیکن میں نے یہ ساٹھ روپے اس لئے کہے ہیں کہ میں وقت کا پابند نہیں رہنا چاہتا۔ جب چاہوں گا آؤں گا۔ جب چاہوں گا۔ چلا جاؤں گا۔ لیکن کاروں وقت پر نکلتا رہے گا۔ بات طے ہو گئی۔

میں نے بابوراؤ کے دفتر میں غالباً چھ سات بیٹے کام کیا اس دوران میں مجھے اس کی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

اس کو ریٹاکار لائل سے مشق تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ دین میں اور کوئی لڑکی اس کے حسن و جمال کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ریٹاکار لائل جیسا کہ عام کر بچپن کے لڑکوں کا دستور ہے۔ میں راستہ پر سنی چلی جا رہی تھی لیکن بابوراؤ کی وجہ سے اس کا عباد بڑھ گیا۔

مجھے یقین ہے اگر ریشا اُردو بول سکتی تو وہ اسے چند دنوں میں نہیں آسمان پر پہنچا دیتا۔ اس کو اپنے قلم اور اس کے زور پر بہت ناز ہے وہ سمجھتا ہے۔ کہ میں اگر کھڑکی کا ایک ٹکڑا لے لوں اور کہنا شروع کر دوں کہ نرتے سمرٹ ہے تو یقیناً وہ چوب بے حرکت نرتے سمرٹ بن جائے گی۔ اہل لوگ اس پر ایمان لائیں گے۔

پدا دیوی گمنامی کے گوشے میں پڑی تھی، مگر جب اس کے آغوش میں کائی تو اس نے اسے ہلکے کرکٹ میں زنگوں کی جھنجھٹ بنا دیا۔ ان دنوں فلم انڈیا کے ہر شامے میں اس کے درجنوں فوٹو ہوتے تھے۔ جن کے نیچے وہ بڑے چست فقرے اور جملے لکھتا تھا۔

بابر راؤ خود ساختہ آدمی ہے۔ جو کچھ بھی وہ اس وقت تھا اور جو کچھ وہاں وقت ہے اس کے بنانے میں کسی کا ہاتھ نہیں۔ جوانی ہی میں اس کی اپنے باپ سے کسی بات پر ان بن ہو گئی تھی۔ چنانچہ دونوں کے تعلقات منقطع ہو گئے بابر راؤ سے میں نے جب بھی بڑھے پائیل کے بارے میں سنا کہ وہ سالانہ حرامی ہے۔

معلوم نہیں ان دنوں میں سے حرامی کون ہے اگر بلکھا پائیل حرامی ہے (بابر راؤ کے معنوں میں) تو خود بابر راؤ بھی اس طبقے سے حرامی پن میں جہاں تک جوتوں کا تعلق ہے۔ کئی جوتے آگے سے اپنے اور اپنے باپ کے ملا کر۔



بابو راؤ کے قلم میں میں نے کیسے طنز کا میں نے ذکر کیا ہے، اگر اس کے اسباب تلاش کیے جائیں تو اس کی ادائل کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ وہ غزنی کا محمود بن کر کہوں بت شکنی کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے کو پچھن میں اس کے والد نے اس کی فطرت توڑنے اور اپنے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کی شادی کی۔ مگر اس کی مرضی کے خلاف — دوسری شادی اس نے خود کی۔ مگر اس مرتبہ وہ خود دھوکہ کھا گیا۔ اور چڑ گیا۔ اپنے آپ سے — ہر ایک سے !

بابو راؤ کے کردار کے خدائشوں میں کئی بت اور دھڑے اور شکستہ پڑے ہیں۔ کئی بڑے حرامی ہیں۔ بیکڑوں، بازاروں، کھیاٹیاں ہیں۔ لیکن ان تہوں کو توڑ پھوڑ کر اسے وہ لذت حاصل ہوئی جو سومات کا مندر ڈھاکر غزنی کے عسود کو ہوئی تھی۔

وہ اونچے استخوان پر کسی کو بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، لیکن جو زمین پر گرا ہوگا۔ اس کو اٹھانے کے لئے وہ کئی کوس چل کے آئے گا۔ اس کو اونچا کرنے کے لئے وہ ایڑی چٹائی کا زور لگا دے گا۔ اور جب وہ افتادہ شخص اس کی دوسے اور اپنی محنت سے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تو وہ اس کو گلانے کی کوشش کرے گا۔

بابو راؤ غلوڑ اصدا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ شاترا رام اس کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا غلام کرکڑ تھا

ایک وہ زلمہ آیا کہ اس نے اسی شانت رام کے غلوں میں جگہ اس کے کردار میں بھی کڑے ڈالنے شروع کر دیئے کاردار کے وہ سخت غلات تھا لیکن بعد میں بابو راؤ کو اس کی ہر اداسپندانے لگی۔ ہزارہ ہوا تو وہ پھر اس کے غلات ہو گیا اس کا اسٹڈیو اور اس کی جائیداد ضبط کرانے کے لئے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا لیکن غریب کی منت اچھی مہنی کر بال بال بچ گیا۔

بچ میں ایک زمانہ آیا کہ اس نے بھاگ دہل اعلان کر دیا کہ مسلم ساری صرف خیال بھائی (مسلمان) جانتے ہیں جو رکھ رکھاؤ جو سلیقہ اور قرینہ مسلمان نظم ڈال کر ڈول کر دے دیتا ہے وہ کسی ہندو نظم باز کے سنے میں نہیں آسکتا میں وہ دن بھی جانتا ہوں جب تک تھوڑی راج کر وہ ایک سیر کرنا بھٹتا تھا اور وہ دن بھی یاد ہیں جب کشورا ہوا سے بہت کھلتا تھا۔

بابو راؤ پر دوسرے پڑتے ہیں نفعیاتی طور پر اس کا دماغ بالکل درست نہیں وہ ایک بکلی ہوئی جھٹکی ہوئی طاقت ہے۔ ایک ایسی طاقت جو کبھی ادھر اپنا سر چھڑتی کبھی ادھر۔ وہ ایک ایسا آرٹسٹ ہے جو اپنے زعم میں گمراہ ہو گیا ہے میں جب کاررواں میں تھا تو مسلم انڈیا میں میری ذہانت و ذکاوت کے چرچے عام ہوتے تھے دہاں سے نکلا تو میں یہ ٹھوکر کون ہے۔ کون بلا ہے۔ ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب میرا نظم آٹھ دن پیش ہوا تو اس نے اس کے دیویوں میں اپنی ٹوپی اتار کر مجھے سلام کیا اور کہا

کو مٹا ہارے ملک کا سفر و زمین افنا نہ لگا رہے۔

جب بابور اور سہجائے قلم کپنی سے غلک تھا تو شانتا اپنے ہندوستان کی خوبصورت ترین فلم ایکٹرس متقی دہاں سے علیحدہ ہوا تو وہ ایک دم بد صورت ہو گئی اس کے خلاف اس نے کافی زہرِ منہ اندھا "میں اگلا گروہ بھی مرے کی کچی ہے ایک روز سواری کا لباس پہنے بابور اور کے دفتر میں گھس گئی اور شراب شراب چھ سات ہنٹاس کے جڑ دیئے۔

منا تھا کہ اونٹ کی کل سیدھی نہیں ہوتی متقی اونٹ کے بعد درجہ بابور اور پٹیل کا آتا ہے اس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں — عرصہ ہوا بیٹی کی انگریزی صحافت کے باڈی اسٹریٹری بارنی مین (مرحوم) نے "مجھے سنی نال" کے نامی کالوں میں چند فقرے بابور اور پر چھت کر دیئے۔

بابور اور کو بڑا تاؤ آیا اس نے حبث ہنگ عزت کا مقدمہ دائر کر دیا اتنی برس کا لڑک بھانڈا بیدہ بارنی مین بہت ہنسا اس نے ایک دوست کے ذریعے سے بابور اور کو یہ پیغام پہنچایا کہ دیکھو اگر تم چاہتے ہو کہ میں لڑوں تو میں تیار ہوں لیکن اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو دو ہزار روپے دے دینا مٹا سے سبھاؤ دتا کہ میں خاموش رہوں۔

بابور اور کو اوڑھتا دیا، پر جب اس نے ٹھنڈے دل سے غور کیا اور بڑے بارنی مین کے کارناموں پر نظر ڈالی تو دو ہزار روپے اس کی غذا کر دیئے۔

وہ بے درق ہے — پرلے درجے کا امن ہے، اور اس کے دل میں انسانیت کی رقی موجود ہے۔ وہ نرا کھرا حیوان نہیں، غریبوں کا ہمدرد ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک مرتبہ اس نے ایک بات پر طوفان برپا کر دیا تھا۔

بٹی میں جو اپنی عمارتیں ہیں ان میں لفٹ لگی ہے، بیڑھیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب کو یہ عیشِ کستال کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن غریب لڑکیوں کو نہیں اگر صرف پانچویں منزل کے لئے ایک خط ہر تو اسے پورا قطب صاحب چڑھنا اور اتنا پڑے گا۔ بابوراؤ نے بہت طوفان مچایا اور اس خلاف انسانیت حکم کے خلاف بہت دیر تک صدائے احتجاج بلند کی اور آخر اسے منسوخ کرا کے رہا۔

اس نے ہندوستانی صنعتِ قلم سازی کی سطح بلند کرنے میں قابلِ ستائش خدمات سرانجام دی ہیں۔ غیر ملکی قلم سازوں سے جو ہندوستان ہندوستانی رعایات اور خود ہندوستانیوں کا مستحکم اڈا یا کرتے تھے۔ اس کا اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یورپ کا دورہ کیا اور ان لوگوں کو ان کی حماقتوں سے آگاہ کیا۔

وہ کئی بچوں کا باپ ہے۔ درجنوں تو نہیں ہوں گے، لیکن ایک درجن کے قریب ضرور ہوں گے۔ کیونکہ ایک دن جب میں اس کے گھر گیا تھا تو اس نے اپنے تمام بچوں کو قالِ ابنِ کاکلم دیا۔ بابوراؤ ان سب کا شیفتہ باپ ہے۔

مگر —

بس اسی گھر کے بدوہ بابوراؤ شروع ہوتا ہے جس کا آغا زادہ اس کے

بعد کچھ ستریں نے دیکھا، تمیز و تائیس، عظمت و بزرگی کے خلاف جو ہلکی سی کد  
اس کی تحریروں میں جھلکیاں بیتی تھیں اور آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی تھیں۔ اب اپنے  
پورے بھیاںک لباس میں جلوہ گر ہے۔

عمود غزنوی کی بت شکنی کا وہ ہلکا سا پرتو، جو اس کے دل و دماغ میں بھڑ  
تھا اب نہایت جھوٹی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

درمیان میں اس نے جواہر لال نہرو کی ہر دلعزیزی اور عظمت سے بڑھ  
کر اس کو گاندھی کا بے پاک اور ساری قوم کے سر کا درد، کہا تھا۔ یہی چیز  
اب بگڑ کر پاکستان کی دشمن بن گئی ہے۔ اس لئے کہ پاکستان حقیقت بن گیا  
ہے اور دنیا کے نقشے پر اپنے لئے ایک اہم جگہ پیدا کر رہا ہے۔ یہ اس کی کج رو  
طبیعت کے خلاف ہے۔

”نظم انڈیا“ میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، صرف نظم سے متعلقہ مضامین  
ہم نے چاہیں۔ اور ہوا کرنے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس میں سیاسیات نے  
بھی سڑکا نا شروع کر دیا۔ اور اب تو یہ حالت ہے کہ سیاسیات، فلیات اور جنیات  
کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ باطل باور لاؤ کی موجود پر ڈوڈ مذہبیت  
کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ایک ہی جگہ پر آپ کو پاکستان، مراجمی ڈسائی، طرزوں  
کے ایم اور دیہا کے پتیا ناچرے کا ذکر ملے گا۔

بیات کا مکہ ہو گا، ساتھ ہی باور لاؤ کی تو مندی اور مردمی، اس کے ساتھ

اپنا یہ کٹھن ساہو اور آخر میں وہ گاندھی ٹوپی کو اپنی پھونکوں سے اڑانے کی کوشش کر رہا ہو گا۔

سیاسیات میں قدم رکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی کوئی ریٹل ہے، سوشل ہے، پتا ہے۔ جسے وہ ڈگڈگی بجا کر بانس پر چڑھا دے گا۔ اور خود قاشا دیکھے گا۔ حالانکہ وہ اندرونی طور پر جانتا ہے کہ فلم سازی کے میدان میں وہ بہت بُری طرح ناکام رہ چکا ہے اور اس میدان میں اس سے بھی زیادہ ناکام رہے گا۔ مگر میز چنڈ اس کی سرشت میں داخل ہے۔

جہ سے آپ پوچھئے تو بابوراؤ کو ہندوستان سے غرض ہے وہ پاکستان سے وہ دراصل غفلت اور بزدلی کا دشمن ہے۔ ورنہ وہ اپنے اس بنگلے میں فرش ہے جو اس نے ایک بڑی رقم دے کر عمر پلک میں خریدے اس ہے اپنی بیکر ٹری سوشل رانی سے خوش ہے جس کو آسمانوں پر چڑھانے کے لئے اس نے فلم اٹلیا دہریں تک وقف کیے رکھا۔ اس کو ایک فلم میں بھی پیش کیا۔ اس خیال سے کہ دوسرے کا ہاتھ رانی کو نہ لگے۔ اس نے یہ فلم خود ڈی آر کٹ کیا۔ لیکن نتیجہ صفر۔

اس کی بابوراؤ کو کوئی پروا نہیں۔ اس کے پاس رانی ہے اس کے پاس ریس کے گھوڑے ہیں۔ اس کے پاس بہترین دفتر ہے۔ اس کے پیٹ میں سرطان ہے۔ لیکن اس کی تجوری میں کافی دولت ہے وہ اگر کامریکے جاسکتا ہے اور اس کا علاج کرا سکتا ہے۔ لیکن اس کو ایک بہت بڑا دک ہے۔

میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اس کو یہ دکھ ہے کہ مسلمان کیوں اتنے بے وفّا ہوتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اس کے کئی مسلمان دوستوں نے اس سے بے وفّائی کی ہے۔ خندو دوستوں نے بھی کی ہے لیکن مسلمان اسے زیادہ عزیز تھے۔ وہ ان کی عزت پسند کرتا تھا۔ ان کا رہن سہن پسند کرتا تھا۔ اس کو ان کی خوبصورتی پسند تھی۔ یہ سب سے زیادہ اس کو ان کے کھانے پسند تھے۔

بابر اور عقائد کے لحاظ سے بہت مدّطن خیال ہے۔ اس کی ایک لڑکی پریس کے ایک مسلمان ملازم کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ مسلمان قریب قریب اُن پر رہا تھا۔ اور بابر اور لڑکی لڑکی غائب ہے۔ کہ قیلم پانتہ تھی۔ لیکن عشق ایسی چیزیں کب دیکھتا ہے۔ دونوں بھاگ گئے۔

بابر اور اُن دونوں کو پکڑ کر لے آیا۔ لڑکی کو عدالتِ سلامت کی اور چاہا کہ یہ قصّہ ختم ہو جائے۔ لیکن لڑکی نہ مانی۔ بابر باؤ نے اس سے پوچھا: تو کیا چاہتی ہے؟

لڑکی نے جواب دیا: میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں؟  
بابر باؤ نے اپنی لڑکی کی شادی پریس میں کام کرنے والے مسلمان سے کر دی۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہنے لگی: یہ تم سالہا مسلمان کیسا ہے۔ ایک ہم سے چوڑی بیٹا ہے۔ پھر کہتا ہے کھانے کے لئے بھی دو۔

اس پس منظر میں بھی بابر لاؤ کی موجودہ ذہنی تحریروں کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ وہ ایک فرد کا با دو تین افراد کا بدلہ ایک پوری قوم سے لینا چاہتا ہے۔ ایک مذہب سے لینا چاہتا ہے بابر لاؤ تاریخ کا طالب علم ہے، کیا اس پر یہ حقیقت آشکارا نہیں کہ یہ قوم اور یہ مذہب سب نہیں، ایک شوس حقیقت ہے !

اسلام اور ہادی اسلام کے خلاف لوگ دریدہ دہشت کرتے رہے ہیں، لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پاکستان کے خلاف بھی لوگ ایک طرح سے ہنگامہ مارتے رہیں گے۔ اس سے کیا ہوتا ہے — مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ حالات نے کتنا شاندار قلم خلافت اور گندگی میں ڈبو دیا — کوئی آرٹسٹ کسی کی مذہبی دل آزاری کا باعث نہیں ہو سکتا، وہ آرٹسٹ تھا، لیکن افسوس کہ عام آدمی بن گیا۔ خدا کی قسم، فلم انڈیا کے چند بچے شمار سے دیکھ، مجھے گھن آنے لگی —

بابر لاؤ اور ایسی گرا رٹ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرٹسٹ جمائیں میں تھا، یا تو سلطان بن کے اس کے پیٹ میں چلا گیا ہے، یا ان کی دو بیویوں کی بددعاؤں پر شا کار لائل کے بریدہ گیسوٹوں — اور پھر دیری اور سر شیلانی کے بہتروں میں دفن ہو گیا ہے۔



## گنچے فرشتے

’ٹھنڈا گوشت‘ کا مقدمہ قریب قریب ایک سال پہلا۔ ماتحت عدالت نے مجھے تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دی۔ کیشن میں ریل کی توہمی ہو گیا۔ اس حکم کے خلاف سرکار نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ مقدمہ کی سماعت اب تک نہیں ہوئی۔

اس دوران میں مجھ پر جو گزری اس کا کچھ حال آپ کو میری کتاب ’ٹھنڈا گوشت‘ کے دربا پے بعنوان زحمت مہر درخشاں مل سکتا ہے۔ دماغ کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پرواہ ہو کر قلم زنی کرتا رہوں۔ پیسے پوچھے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ کوئی چیز لالٹ ہو جائے۔ تو اکرام سے کسی کو نہ میں بھیجے کہ چند برس قلم اڑ

دوات سے دودھ رہا۔ دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو انہیں پچاسی کے تختے پر لٹکا دوں۔ الاٹ منٹ میسر ہو تو بلیک مارکٹنگ شروع کر دوں، یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔ آخر الذکر کام میں نے اس لئے ذکر کیا کہ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ ساری شراب میں خود پی جایا کروں گا، خرچ ہی خرچ ہوگا، آمدن ایک پیسے کی بھی نہ ہوگی۔ بلیک مارکٹنگ اس لیے ذکر سکا کہ سرمایہ پاس نہ تھا ایک صرف الاٹ منٹ ہی تھی جو کار آمد ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ کو حیرت ہوگی۔ مگر یہ واقع ہے کہ میں نے اس کے لئے کوشش کی پچاس روپے حکومت کے خزانے میں جمع کرا کے میں نے درخواست دی کہ میں امرت سرکا مہاجر ہوں، بیکار ہوں، اس لیے مجھے کسی پریس یا سینما میں حصہ الاٹ فرمایا جائے۔

درخواست کے چھپے ہوئے فارم تھے، ایک عجیب و غریب قسم کا سوالیہ تھا۔ ہر سوال اس قسم کا تھا جو اس امر کا طالب تھا کہ درخواست کنندہ پیٹ بھر کے جھوٹ بولے۔ اب یہ عجیب ٹھہ میں شروع سے رہا ہے کہ جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ میں نے الاٹ منٹ کرانے والے بڑے بڑے گھاگوں سے مشورہ کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ تمہیں جھوٹ بولنا ہی پڑے گا، میں راضی ہو گیا۔ لیکن جب چھپے ہوئے فارم کی خالی جگہیں بھرنے لگا تو روپے میں صرف دو یا تین آنے جھوٹ بول سکا۔ اور جب انٹرویو ہوا، تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ

صاحب جو کچھ درخواست میں ہے بالکل جھوٹ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ہندوستان میں کوئی بہت بڑی جائیداد چھوڑ کے نہیں آیا۔ صرف ایک مکان تھا اور بس۔ آپ سے میں خیرات کے طور پر کچھ نہیں مانگتا۔ میں بزمِ خدیوت بڑا انسانہ نگار تھا۔ لیکن اب مجھے عسوس ہوا۔ کہ یہ کام میرے بس کا لوگ نہیں اللہ جل میاں ایم۔ مسلم اور بھارتی دت کو سلامت رکھے۔ میں ان کے حق میں اپنی انسانہ نگاری سے سبک سر ہوتا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حکومت مجھے کوئی ایسی چیز لاٹ کرے جس کے لئے مجھے کام کرنا پڑے اور اس کام کی اجرت کے طور پر مجھے پانچ چھ سو روپیہ ماہوار مل جایا کرے۔

حیرت ہے کہ میری اس گفتگو کا اثر ہوا۔ قریب تھا کہ مجھے کسی برف خانے میں کوئی حصہ الاٹ ہو جائے کہ بورڈ کے ممبروں سے کسی نے کہہ دیا تم لوگ یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ یہ شخص جس کا نام سادات حسن منٹو ہے۔ ترقی پسند ہے۔ چنانچہ ایک تعلیم میری درخواست مسترد کر دی گئی۔

ادھر یہ ہوا۔ ادھر ترقی پسند مصنفین نے رجعت پسند قرار دے کر میرا حق پانی بند کر دیا۔ یہ بھی خوفِ لطیف رہا۔ بہت رینک سوچا کیا، آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ مولے نے اور ک ہٹی بہنیاں۔ چنانچہ قلم اٹھا کر پھر کھنا شروع کر دیا۔ لیکن لکھنے سے پہلے ہی مرحلہ پیش رو کا موضوع کیا ہو۔ فورم کیسی ہو۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی جان پہچان کے ایکٹر

ایکٹرسوں پر کچھ لکھوں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون چنانچہ 'پری چہرہ نسیم' باتر کے عنوان سے ہوا جو روزنامہ آفاق میں چھپا۔ میں خوش تھا کہ ایک رشتہ عمل آیا ہے جو حکومت کے احتساب سے پاک صاف رہے گا۔ اور مہارت پسند لوگوں کے لئے موجب اطمینان ہوگا۔ لیکن یہ مضمون چھپتے ہی طوفان برپا ہو گیا۔ آفاق کے دفتر میں بے شمار خطوط آئے جن میں مجھے موعن و مطعون گردانا گیا۔

۳۰ جولائی کے آفاق میں ایک صاحب قاضی م۔ بشیر محمود صاحب ایوب ناضل کا ایک خط ایڈیٹر کے نام چھپا — ان کا مختص غلط فرمایا۔

سعادت حسن منٹو کا مضمون — بے ضرر مضمون  
پری چہرہ نسیم ہاتر نظر سے گزرا۔ ساتھ ہی نسیم بانو کا  
مکتوب اپنے بجائی کے نام بھی پڑھا۔

منٹو نے بڑے اطمینان اور لطف سے لے کر بہن کے  
تجاہد و صفت، مناقب، فقر و شہیں اور حکایتیں توضیح اور  
وضاحت کے ساتھ رقم کی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہن  
کی قدر و منزلت، ساتھ اور وقعت اور وقار کو کچھ حد تک  
نظر انداز کر چکے ہیں۔ کسی حد تک یہ بہن کی توہین و تہلیل نہیں  
ظہار ہوگا۔

ایسا لکھتے ہوئے انہیں حجاب و مائل کو خدا حافظ

کہنا پڑا ہر گاہ مجھے اُن کے الفاظ پر اعتراض نہیں، حرمت  
و کلمات پر گرفت نہیں اور نہ ہی معنوں پر حرف گیری کر  
رہا ہوں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا نسیم باقر، منٹو صاحب  
کی حقیقت یہی ہے؟ — کیا منٹو اس کے معاشرے پر روشنی  
ڈالنے کی قوت اور جرات رکھتا ہے؟

منٹو بڑا خطرہ ہے۔ میرے دل میں اس کی بے انتہا  
حرمت ہے۔ میں اس کے کافی کارنامے دیکھ چکا ہوں۔ اب  
ایک اور بے مروت قسم کا کارنامہ بھی لگے انھوں نے دیکھ لیا۔ میں  
منٹو دوست کی بڑی چہرہ نسیم باقر پر رائے زنی یا کتہہ پیمانی  
نہیں کر رہا۔ اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں — اور پھر اپنے منٹو  
پر کتہہ چینی کر بھی کیسے سکتا ہوں۔ اس کی بلند آشتیانی  
نہم ابھی میری پہنچ نہیں۔

یہ خط چھ کر مجھے بہت کوفت ہوئی۔ اسے دو کرنے کے لئے میں نے  
یہ چند حرف لکھ کر محمد سرور صاحب کو بھیج دیئے۔

اس خط پر اور ایسے ہی دوسرے خطوں پر جو اس معنوں کے متعلق آفاق الکر  
دوسرے انجیلوں میں پچھتے رہے، میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

سرد صاحب نے شروع شروع میں ان خطوط کی کوئی پرواہ نہ کی اور غصے  
 کہا: تم کھٹے رہو۔ یہ سلسلہ کافی دلچسپ ہے، جاری رہنا چاہیے۔۔۔ میں نے جاری  
 رکھا، عنایتِ ملامت میں جاری رہی۔ شام پر مضمون چھپا تو سیالکوٹ کی  
 ایک خاتون تیربانو صاحبہ نے ایک طویل خط لکھا۔ جسے پڑھ کر یقین ماتیے بٹھے  
 بہت ترس آیا۔ اس کے چند اقتباس دیکھئے۔

میں سینا دیکھنا گناہ کبیرہ میں شمار نہیں کرتی، تصویروں پر  
 نظر پڑتے ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے نہیں دوڑی جاتی  
 مگر میرے پاس بچے ہیں۔ اور میری آرزو ہے کہ وہ نیک  
 اخلاق ہوں سینا دیکھ دیکھ کر اخلاق بتانا نہیں بگڑتا ہے  
 اس لیے میں نے سینا دیکھنا چھوڑ دیا۔۔۔ میں جانوں  
 گی کہ وہ بھی جانیں گے۔ زبردستی روکا تو اس آرزو کو  
 دل میں پالتے رہیں گے۔ اور جب موقع ملے گا کہ  
 پوری کر لیں گے۔

میں اتنی بڑی ہوں مگر بعض تصویروں پر نظر ڈالنا  
 طبیعت کو گوارا نہیں ہوتا۔ ایسا پرچہ عموماً ہوتا ہے کہ  
 کیا بتاؤں۔ جیسے کسی کی خلوت میں بغیر اجازت گھسے  
 جا رہے ہیں۔ اور یہ بات آدابِ شرافت کے خلاف

ہی تو ہے۔ آپ کہیں گے، ایسے رسالے، اخبار، کتب ہیں  
 بچوں کو ذہنی دکانی جائیں مگر یہ کتنا مشکل کام ہے کہ پڑھتے  
 پڑھتے اخبار یا رسالہ میٹر پر لٹکا دینے کی بجائے خاص  
 اہتمام سے اسے میں بند کرنے کی فکر کی جائے۔

ذرا مری کی دھن دوبارہ پڑھ کر بتائیے کہ یہ کیا چیز  
 ہے؟ — کیا کوئی شخص خواہ کتنا بھی بچی سے مُد  
 اور اخلاق باختم ہو۔ کیا اپنے گھر میں بیوی بچوں کے درمیان  
 بیٹھ کر یہ پُر لطف یا گھناؤنے کتبہ بات دہرا کر پست  
 کرتا ہے؟ — اُس نے چاہے کتنے ہی خم لٹھٹائے  
 ہوں، شراب کے تالاب میں غوطے لگائے ہوں، چلی  
 کر بھند رہتا ہو۔ یا مغنطیات بکتا ہو۔ کتنی ہی عورتوں  
 کو دسترخوان کی پشتی بناتا ہو۔ جب یاد کیا ہو۔ سالی  
 عورت کہا ہو۔ اور نہ پا کر بستر کو آگ لگا دی ہو۔  
 ان چیزوں کو اخباروں کے ذریعے سے پھیلا کر  
 کون سی انسانیت اور اخلاق کی خدمت ہوتی ہے۔  
 دوسروں کے بھی گھر ہوتے ہیں۔ اُن کے بھی بیوی بچے  
 ہوتے ہیں۔ روکے لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کا خیال بھی

اپنے گھر اور بچوں کی طرح ہونا چاہیے۔ کل دنیا مردوں  
 ہی کی تو نہیں کہ خاک چھنکتے پیوس بگنہ گی اچھالیں  
 عموں، لعلوں، معصوموں کو بھی سنائیں، کوئی پوچھنے والا  
 نہیں — کوئی کہاں بھاگے۔ گھروں میں چسپیں نہیں  
 اعتبار، رسالے اور ادب جو بیچ بوری ہے ہیں۔ ماں، باپ کو  
 چاہیے کہ وہ بھی ان کی پرورش اور آبپاشی شروع  
 کر دیں تاکہ بہتر اور مکمل نتیجہ سامنے آئے۔ باپ بیٹے  
 کو سکھائے کہ اس طرح شراب کے تالاب میں غوطہ  
 لگا کر ان سایوں کو اس طرح گھسیٹ لے جانا چاہیے  
 اور مائیں اپنی بیٹیوں کو نئے نئے دام، بھانسنے کے دام  
 حبلے سمجھادیں۔ استغفر اللہ، کیسی انسانیت اور کیسا  
 معاشرہ ہوگا — ذرا تصور تو کیجئے۔ سوچ سوچ کر  
 میں کتنا صحتی ہوں۔

میں نے جب یہ خط پڑھا تو بھنڈا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ مجھے تیرافون کی حالت  
 پر بہت ترس آیا، میں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو اس خاتون پر میں نے اتنی  
 بہت علم کیا ہے جس کا کنارہ مجھے ضرور ادا کرنا چاہیے۔ لیکن پھر میں نے سوچا اگر  
 میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق یہ کنارہ ادا کرنے کی کوشش کی تو وہ ضرورت



جو بعض تصویریں پر نظر ڈال کر سچے بن محسوس کرتی ہے اور یہ سمجھتی ہے گوڑا رو  
کسی کی خلوت میں اجازت کے بغیر گھس گئی ہے۔ یقیناً اس کی تاب نہ لا کر یہ ہوش  
ہو جائے گی۔ اہہ بہت ٹھکن ہے مری بھی جائے۔

مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ نیرنا تو ذہنی مریضوں کی جس فہرست  
میں آتی ہے، اس کے تمام افراد قابلِ رحم ہیں — ان کا علاج جہاں تک  
میں سمجھتا ہوں اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ان کے سامنے بڑوں کے کاگ  
اڑا اڑا کرتا لاپ بھرے جائیں۔ گندگی اچھالی جائے۔ اپنے سر میں خاک ڈالی  
جائے، بال توڑے جائیں۔ غفلت کی جائیں۔ یہ کام خود سے نہ ہو سکے  
تو کرائے پر آدمی لائے جائیں۔ جو ماہی تباہی کہیں — شیخ، میسوی صحت  
رومان اور اسی قسم کے دوسرے پیرچوں کے تمام مضامین اشتہاروں سمیت  
پڑھ کر بار بار انہیں سنائے جائیں۔ اگر یہ نسخہ کارگر ثابت نہ ہو تو سماعت  
حسن غٹو سے کہا جائے کہ نیرنا کو کا پرانا سینڈل اٹھائے اور اپنے سر پر لاد  
کر اسے گھما کر دے۔

میں نے بہت سوچا تھا کہ ان مضامین کے عجوبے کا نام میں نے بگے فرشتے  
کیوں رکھا ہے — اب یہ سطور کتے کتے اس کی وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی ہے  
بگے یقین ہے کہ میل تیا یا بٹا نسخہ ہرگز ہرگز ٹھہر نہیں ہے اور لوگ اپنی  
کمزوریاں دور کرنے کے لیے مزور علیہ پیرگیلاناں کے غلام عہد ہی کی گویاں

خریدیں گے، اور انجام کار سیانکوٹ کے کسی چوراہے میں کھڑے ہو کر مجھے  
 نیراتر کے پرانے یا نئے سینڈل سے اپنا سر گھنا کرنا پڑے گا۔  
 میراجی والا مضمون تین گونے شائع ہوا تو اس سے بھی لوگوں کو تکلیف  
 پہنچی۔ آفاق کے ایڈیٹر کو ایک صاحب خواجہ فرخندہ ہنبادی صاحب  
 نے یہ خط لکھا۔

آپ نے آفاق کے ادبی ایڈیشن میں سماعت حسن سنٹر  
 کا مضمون تین گونے شائع کر کے میراجی مرحوم صاحب  
 اور خود آفاق کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ مضمون ایک  
 مخصوص ادبی حلقے کے لیے تو شاید مزدوں تھا، لیکن  
 ایک سنجیدہ اخبار اس کی اشاعت کا قطعاً متعل نہیں  
 ہو سکتا تھا۔

دنیا کے ہر مذہب ملک اور ہر مذہب سماج میں یہ  
 اصول مروج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں  
 نہ ہو اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے، اس کے  
 صرف محاسن بیان کیے جاتے ہیں، اور عیوب پر پردہ  
 ڈالا جاتا ہے۔ میراجی میں اگر کچھ کمزوریاں تھیں تو ان سے  
 صرف ان کا مخصوص حلقہ احباب ہی واقف تھا، دنیا تو

انہیں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے جانتی اور  
 عزت کرتی تھی۔ کیا غضب کہ ان کے ٹکڑے یاران کے  
 مرتے کے بعد ان بولتوں کو الم نشرح کر رہے ہیں۔  
 عصمت نے دلدلی لکھ کر اپنے بھائی کو جس طرح  
 خراج ادا کیا ہے، غالباً ہمارے ادیب اب اسی ڈگر  
 پر چل رہے ہیں۔ اور پھر اس معنوں کے معنی حصول  
 کی کراہت کی حد تک مرثیہ پناہ بھنا، نہ نفاست پسند  
 طبائع اسے برداشت کر سکتی ہیں، نہ یہ معنوں گھر کی  
 غلائیں پڑھ سکتی ہیں، نہ بچے ہڈیاں، اگر منڈ کے بغیر  
 آپ کا اہل ایڈیشن مکمل نہیں ہو سکتا تھا تو ایڈیٹر  
 کے قلمی احتساب کو کیا ہو گیا تھا۔

میراجی مرحوم، منثور اور آفاق کے ساتھ جو ظلم ہوا تھا، وہ تو ہو گیا، اس  
 جھوٹے کی اشاعت سے جو مزید ظلم ہو گا۔ اس کا میں گواہ ہوں، اور یہ گناہ  
 بنیادی صاحب کے سرچرہ کر رہا ہوں، انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ  
 دنیا کے ہر مذہب ملک اور ہر مذہب سماج میں یہ اصول مروج ہے کہ مرتے  
 کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔  
 اس کے صرف محاسن بیان کیے جاتے ہیں اور محبوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔

ویسے میں ایسی دنیا پر ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار رحمت  
 بھیجتا ہوں، جہاں یہ اصول مروج ہو کر مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور شخص  
 لائڈر سی میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمتہ اللہ علیہ کی  
 کھونٹی پر شکا دیا جائے ۔

میرے اصلاح خانے میں کوئی شاذ نہیں، کوئی شیوہ نہیں، کوئی غصہ ٹھکر پیدا  
 کرنے والی باتیں نہیں — میں بازو سلگا رکتا نہیں جانتا — آغا حشر کی  
 بھینگی آنکھ مجھ سے کسی حدیث میں ہو سکی۔ اس کے منہ سے گایوں کے بھائے  
 میں بھول نہیں جھڑاسکا۔ میراجی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی۔ اور نہ  
 میں اپنے دوست شام کو مجبور کر سکا ہوں۔ کہ وہ برغز و غلط عورتوں کو سبیاں نہ  
 کہے — اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے، اس کا منڈان ہوا ہے اور یہ دم  
 میں نہ بڑے سلیقے سے ادا کی ہے ۔

سعادت حسن منٹو

(علاء الدین سلیمی کاتب - اردو بازار لاہور)

# سَعَادَتِ حَسَنِ مَنُو

منو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو برا راست پر  
 لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طزیم مسکراہٹ کے ساٹھاناٹو  
 سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دُور  
 بھیں جاسکتے اس اعتبار سے منو کو انسانی فطرت پر کہیں  
 زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

”منو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔  
 چٹو ہے، چکالے اُڑا رہا ہے ایک نشتر بن کر سوج کے فلد  
 مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے مریض چیختا ہے چلنا ہے  
 بین کرتا ہے، منو کو اس کی پرواہ نہیں وہ اس قدر بیچم  
 ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

”منو آدم کی جزائٹ گناہ کا قائل ہے۔ منو کا انسان نوری  
 ہے نہ تاری، وہ آدمِ خاکی ہے۔۔۔ وہ وجودِ خاکی جس میں  
 بنیادی گناہ، فساد، قتل و خون و غیرہ کے باوجود، خدا نے نوری  
 فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

ممتاز شیریں